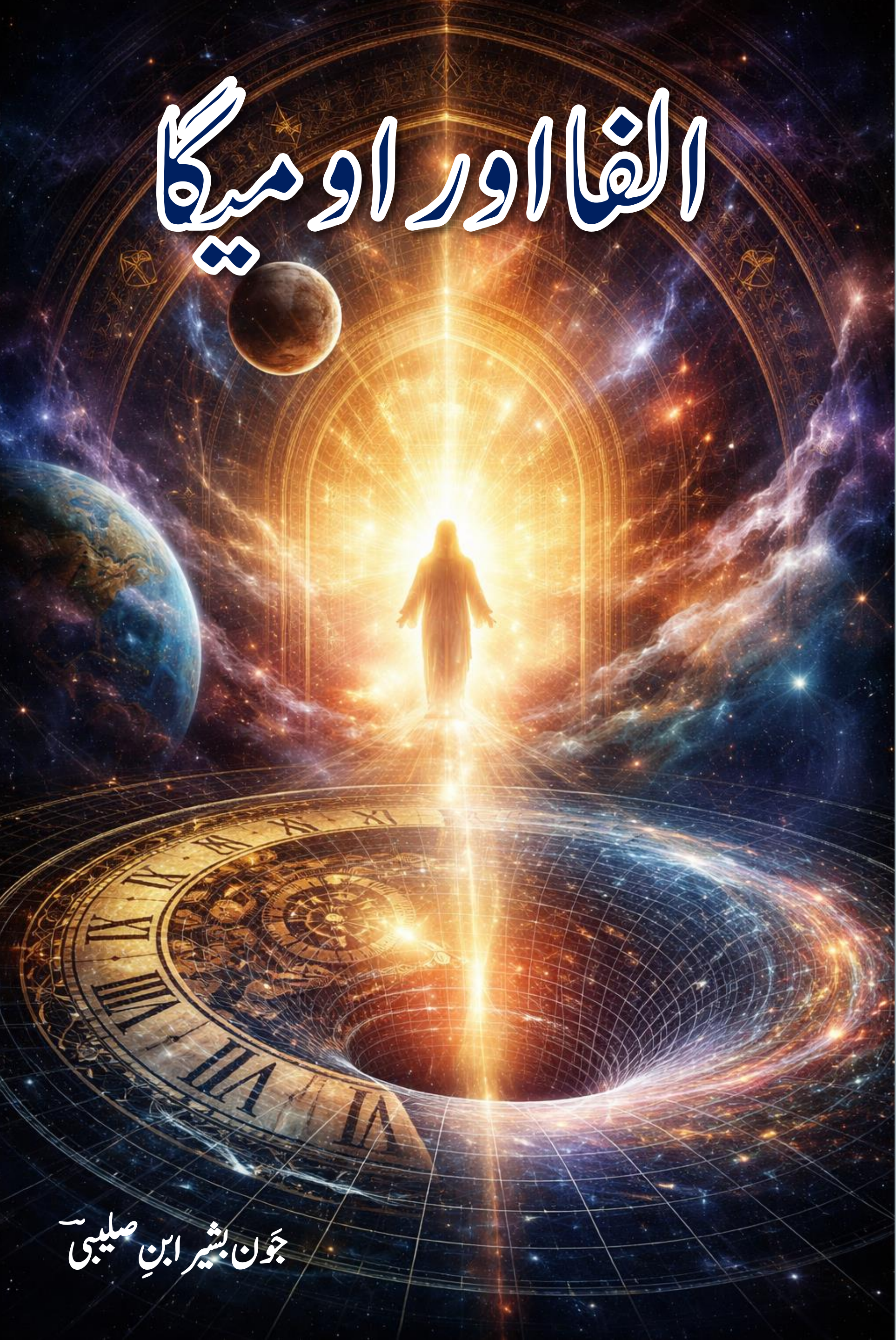


الفا اور اومیگا

جوَن بشیر ابنِ صلیبیؔ

الفا اور اومیگا

(مسیحی تصورِ زمان و مکاں)

از قلم
جوّن بشیر ابنِ صلیبیؔ
ایم اے (فلسفہ، مذہب و الٰہیات)

NIBS Publications
E-mail: nibspakistan@gmail.com, Tel: +923433210787

نام کتاب	:	**الفا اور اومیگا**
مُصنف	:	**جَون بشیر**
کمپوزنگ	:	**آرٹ و گراف**، کراچی
اشاعت بارِ اوّل	:	**مارچ 2026ء**
تعداد	:	**500**
قیمت	:	**روپے**

کتاب کے حصول کے لئے رابطہ:

Mobile Nos. +923433210787, +923022347657

WhatsApp: +923433210787

Email: nibspakistan@gmail.com

فہرستِ مندرجات

انتساب

دورِ جدید کے اُن تمام مبشرینِ انجیل کے نام
جو ظاہری شناختوں سے آزاد رہ کر
اپنے باطن میں روحِ سرمدی سے گہرا تعلق قائم کئے ہوئے ہیں
اور ہر طرح کی جغرافیائی، نسلی، قومی اور مذہبی تفریق سے
بلند و بالا ہو کر زمان و مکاں کو یکساں نظریے سے دیکھتے ہیں

مقدّمہ

انسانی فکر کی تاریخ میں چند سوال ایسے بھی ہیں، جو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو حیرت و جستجو میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ اُنہی میں سے ایک بنیادی سوال زمان و مکاں (Time and Space) کی حقیقت کا ہے۔ ہم ہر لمحہ وقت کے بہاؤ میں جیتے ہیں، ماضی کی یادوں اور مستقبل کی اُمیدوں کے درمیان سفر کرتے ہیں، مگر اِس کے باوجود یہ سوال باقی رہتا ہے کہ "وقت حقیقت میں ہے کیا"؟ کیا یہ ایک مطلق حقیقت ہے؟ یا محض انسانی شعور کا ایک ادراک؟ اور کیا کائنات کی مادی وسعتوں میں پھیلا ہوا مکاں صرف ایک طبیعی فریم ہے، یا اِس کے پسِ پردہ کوئی گہرا روحانی مفہوم بھی کارفرما ہے؟

جدید سائنس (خصوصاً طبیعیات اور کاسمولوجی) نے بیسویں صدی میں اِن سوالات کو نئے انداز سے اٹھایا۔ اضافیت کے نظریے نے یہ تصور پیش کیا کہ زماں اور مکاں دو الگ حقیقتیں نہیں، بلکہ ایک مشترکہ تانے بانے، یعنی "Space-Time" کے دو پہلو ہیں۔ اِس دریافت نے کائنات کے بارے میں صدیوں سے قائم بہت سے تصورات کو بدل دیا اور انسان کو اِس احساس سے دوچار کیا کہ جس حقیقت کو وہ مطلق سمجھتا تھا، وہ دراصل مشاہدے اور حالات کے ساتھ بدل سکتی ہے۔

لیکن وقت کی حقیقت صرف سائنسی یا فلسفیانہ مسئلہ نہیں۔ مذہب اور الٰہیات نے بھی ہمیشہ اِس سوال سے گہری وابستگی رکھی ہے۔ بائبل کی روایت میں وقت کو محض ایک دائرہ یا لکیر نہیں، بلکہ ایک معنی خیز سفر کے طور پر دیکھا جاتا ہے، یعنی ایک ایسا سفر، جو تخلیق سے شروع ہو کر ایک مقدّر انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ اِس تصور کے مطابق تاریخ محض واقعات کا سلسلہ نہیں، بلکہ خدا کی حکمت اور مقصد کے تحت وقوع پذیر ہونے والی داستان ہے۔

مسیحی الٰہیات میں اِس تصور کی معراج یسوع مسیح کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ مسیح کو صرف ایک تاریخی شخصیت کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اُس ہستی کے طور پر سمجھا جاتا ہے، جس میں ابدیت نے وقت کے اندر ظہور کیا۔ گویا لامحدود کلامِ خدا نے انسانی تاریخ کے ایک لمحے میں خود کو ظاہر کیا، اور اِس طرح ابدیت اور زمان کے درمیان ایک ایسا رابطہ قائم ہوا، جس نے انسانی وجود کے معنی کو نئی جہت عطا کی۔

زیرِ نظر کتابچہ اِسی فکری سفر کی ایک مختصر مگر جامع کاوش ہے۔ اِس میں فلسفہ، سائنس اور مسیحی الٰہیات کے اہم مباحث کو یکجا کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمان و مکاں کا مسئلہ محض طبیعیات کی بحث نہیں، بلکہ انسانی وجود، تاریخ اور ایمان کے گہرے سوالات سے جڑا ہوا ہے۔ اِس مطالعے کا مقصد قاری کو یہ احساس دلانا ہے کہ انسان اگرچہ وقت کی قید میں زندگی بسر کرتا ہے، لیکن مسیحی پیغام اُس کے سامنے ابدیت کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔

میری دعا ہے کہ یہ مختصر تحریر قارئین کو صرف فکری معلومات ہی فراہم نہ کرے، بلکہ اُنہیں اِس سوال پر بھی غور کرنے کی دعوت دے کہ اُن کی اپنی زندگی وقت کے بے رحم بہاؤ میں گم ہو رہی ہے، یا وہ اُس ابدی حقیقت کی تلاش میں ہیں، جو وقت سے ماورا ہو کر بھی انسانی تاریخ میں جلوہ گر ہوئی۔

جوَن بشیر ابنِ صلیبیؔ

مارچ16، 2026ء

لاہور

پہلا باب

گردشِ ایام اور ابدیت کا لمس

زمانی قید سے ماورائی حقیقت تک

مختلف تہذیبوں اور مذاہب (مثلاً سامی و غیر سامی مذاہب اور یونانی فلسفہ و عقلی مذاہب) نے وقت کی گردش کو مختلف طریقوں سے سمجھا ہے۔ ہمارے مطالعہ کا بنیادی مرکز یسوع مسیح کی ذات ہے، جو وقت کی قید اور ابدیت کی لامحدود وسعت کے درمیان ایک مضبوط "مرکزی لمحے" (Central Moment) کی مانند ہے۔ یہ خالصتاً بائبلی خیال ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ مکمل طور پر اِس خیال کو تقویت دیتا ہے۔ اِس طرح ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ بائبل انسانی تاریخ کو خدا کی طرف گامزن ایک سفر کے طور پر پیش کرتی ہے۔

وقت کا اسیر اور بقا کی تمنا:

انسان کی داستانِ ہستی ایک عجیب المیے سے عبارت ہے۔ ہم وقت کے بے رحم دھارے میں مقید ہیں، مگر ہمارا دل کسی ایسی سرزمین کے لئے تشنہ لب ہے، جہاں وقت کا گزر نہ ہو۔ ہم "لمحہِ موجود" کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک ایسی حقیقت کو پکارتے ہیں، جو زمان و مکاں کی قید سے ماوراہو۔ ہماری یہ وجودی کشمکش محض ایک ذہنی الجھن نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی فطرت کا وہ بنیادی جوہر ہے، جو اُسے مادی دنیا کے دیگر جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ سطورِ ذیل میں ہم اِسی فکری گتھی کو سلجھانے کی ایک علمی اور وجدانی کوشش کریں گے، جو ہمیں وقت کی فانی دہلیز سے ابدیت کے لازوال دربار تک لے جائے گی۔

پہلا نکتہ – انسانی وجود کی ثنویت:

انسانی زندگی ایک گہرے وجودی تضاد کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ایک طرف ہماری مادی جبلت ہے، جو ہر گزرتے ہوئے پل کے ساتھ فنا کی جانب مائل ہے، اور دوسری طرف ہمارا شعور ہے، جو لافانی سچائیوں کا

ادراک رکھتا ہے۔ ہم وقت کے اندر سانس لیتے ہیں، لیکن ہماری فکری پرواز وقت سے پرے جانے کی متمنی رہتی ہے۔ یہ "ثنویت" (Duality) اِس بات کی غماز ہے کہ انسان محض ایک حیاتیاتی حادثہ نہیں ہے، بلکہ اُس کا خمیر کسی ایسی حقیقت سے اٹھا ہے، جو ازلی اور ابدی ہے۔ ہماری یہ بے چینی دراصل اُسی بلند تر حقیقت کی پکار ہے، جس سے ہمارا رشتہ ازل سے جڑا ہوا ہے۔

دوسرا نکتہ — تمدّنوں کے آئینے میں ادراکِ زماں:

تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار اور تہذیبوں نے زماں کو سمجھنے کے لیے الگ الگ فکری زاویے اپنائے ہیں۔ نامور مفکر میرچیا ایلیادے (Mircea Eliade) اپنی معرکۃ الآرا کتاب "The Myth of the Eternal Return" میں اِس حوالے سے گہری بصیرت فراہم کرتا ہے کہ قدیم معاشرے وقت کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، مثلاً:

1۔ ہندومت: یہاں زماں کا تصور "چکروی" (Cyclical) ہے۔ وقت ایک لامتناہی دائرہ ہے، جہاں ہر آغاز انجام کی طرف اور ہر انجام ایک نئے آغاز کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس تصور میں "تقدیر پرستی" (Fatalism) کا غلبہ ملتا ہے، جہاں انسان گردشِ ایام کے چکر میں خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔[1]

2۔ یونانی فلسفہ: قدیم یونانی فکر میں وقت کے خطی اور چکروی تصورات کا ایک پیچیدہ امتزاج ملتا ہے، جہاں تاریخ کو دائروں اور ارتقائی لہروں کے پیچ سمجھنے کی سعی کی گئی۔[2]

3۔ یہودیت و مسیحیت: یہاں سے وقت کے ایک انقلابی تصور کا آغاز ہوتا ہے، جسے "خطی تاریخ" (Linear History) کہا جاتا ہے۔ وقت اب محض ایک دائرہ نہیں، بلکہ ایک بامقصد سفر ہے، جس کا رُخ

---

[1] قدیم ہندوستانی عقیدے (زمان و مکاں) از وزیر حسن عابدی، ادارہ رُشنائی لاہور، سن ندارد

[2] ایضاً

"میلان الی اللہ" کی جانب ہے۔ اِس تصور نے دنیا کو "اُمید" اور "ارتقاء" (Progress) کا مژدہ سنایا، جہاں ہر گزرتا لمحہ انسان کو اُس کے حتمی مقصد کے قریب تر کرتا ہے۔[3]

تیسرا نکتہ - کائنات کا نظم اور ایام کی ترتیب:

وقت کوئی بے ہنگم طوفان نہیں، بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب کا مظہر ہے۔ بائبل کی کتاب "واعظ" میں وقت کے اِس نظم کو نہایت پُر اثر اور شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، جو انسان کو بے یقینی کے بھنور سے نکال کر فکری سکون عطا کرتا ہے: "ہر چیز کا وقت مقرر ہے اور ہر کام جو آسمان کے نیچے ہوتا ہے اُس کا ایک وقت ہے" (واعظ 3:1-11)۔

واعظ کی یہ بصیرت احساس دلاتی ہے کہ ہماری زندگی کے نشیب و فراز، خوشی اور غمی، اور پیدائش و موت، کچھ بھی اتفاقی نہیں۔ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرّہ ایک الٰہی نقشے کے تحت متحرک ہے، تو وقت کی تندی اُس کے لیے خوف کے بجائے دانش کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

چوتھا نکتہ - مسیح، زمان و مکاں کا نقطۂ اِتّصال:

اِس تمام فکری بحث کا حاصل یہ سوال ہے کہ ایک فانی انسان اِس لافانی ابدیت سے کیسے جُڑ سکتا ہے؟ یہاں مسیح کی ذات ایک ایسے "لمحے" کے طور پر اُبھرتی ہے، جو محدود (Finite) اور لامحدود (Infinite) کے درمیان حائل خلیج کو پاٹ دیتی ہے۔ ممتاز الٰہیات دان پال تِلک (Paul Tillich) نے اپنی فکر[4] میں اِسی سنگم کی وضاحت کی ہے، جہاں "مُقدّس" اور "وقت" ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ پال تِلک کے مطابق مسیح کی صورت میں ابدیت بذاتِ خود وقت کی حدود میں داخل ہوئی، تاکہ وقت کے اسیروں کو ابدیت کا راستہ دِکھا سکے۔ وہ محض ایک تاریخی شخصیت نہیں، بلکہ وہ "نقطۂ اِتّصال" ہے، جہاں آسمان زمین سے ملتا ہے۔ اِس "لمحے" کے ذریعے انسان اپنی محدود عمر کے چند سالوں میں بھی اُس لازوال حقیقت کا ذائقہ چکھ سکتا ہے، جو موت کے بعد بھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔

---

[3] ایضاً

[4] پال تِلک کے جس نظریے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُسے "الٰہیاتِ ثقافت" (Theology of Culture) کہا جاتا ہے۔

وقت اور ابدیت کی یہ داستان محض ایک فلسفیانہ بحث نہیں، بلکہ آپ کے وجود کی سچائی ہے۔ ہم سب اُس لمحے کے کنارے کھڑے ہیں، جہاں ایک طرف گزرتی ہوئی زندگی کی ریت ہے اور دوسری طرف ابدیت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رہے۔ آج جب آپ اپنی زندگی کی گھڑی کو ٹِک ٹِک کرتے سُنیں، تو ذرا رُک کر خود سے یہ سوال کیجیے کہ کیا آپ کا سفر محض اِن گھٹتے ہوئے ثانیوں کی نذر ہو رہا ہے، یا آپ نے اُس "لمحے" کو پا لیا ہے، جو آپ کو ایام کی گردش سے نکال کر ابدیت کے لمس سے آشنا کر سکے؟ یاد رکھیے! وقت گزر رہا ہے، مگر حقیقت آپ کے انتخاب کی منتظر ہے۔

دوسرا باب

وقت کی حقیقت

قدیم فلسفے کے چار حیرت انگیز اسباق

یہاں ہم وقت کے متعلق مختلف تاریخی اور فلسفیانہ نظریات کا ایک جامع خلاصہ پیش کریں گے۔ اِس میں افلاطون کے اِس تصور کا ذکر ہے کہ وقت ابدیت کا ایک متحرّک عکس ہے، جبکہ ارسطو اِسے حرکت کی پیمائش قرار دیتا ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے نزدیک وقت کا تعلق انسانی شعور اور یادداشت سے ہے، جبکہ بوئتیس اِسے الوہی تناظر میں ایک ابدی لمحہ قرار دیتا ہے۔ اِن تمام ماخذات کا نچوڑ یہ ہے کہ فلسفہ وقت کی ماہیت کی وضاحت تو کرتا ہے، مگر اُسے مادی صورت میں مکمل طور پر مجسم کرنے سے قاصر رہا ہے۔

وقت ایک ایسا لاینحل معمہ ہے، جو ریت کی طرح ہماری گرفت سے مسلسل پھسل رہا ہے، مگر اُس کی ماہیت آج بھی انسانی فہم کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہم اِس تغیرِ پیہم کو ہر لمحہ محسوس تو کرتے ہیں، لیکن جب اُسے لفظوں میں مجسم کرنے کی باری آتی ہے تو زبان گنگ رہ جاتی ہے۔ صدیوں سے مفکرین اِس طلسم کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آیا وقت کوئی خارجی حقیقت ہے یا محض ہمارے تخیل کا ایک پرتَو؟ کبھی ایک خوشگوار ساعت لمحوں میں بیت جاتی ہے اور کبھی کرب کا ایک ثانیہ صدیوں پر محیط محسوس ہوتا ہے۔ فلسفے کی تاریخ ہمیں وقت کے اِسی پیچیدہ ادراک کو سمجھنے کے لیے چند نہایت گہرے اور بصیرت افروز زاویے فراہم کرتی ہے۔

افلاطون—وقت ابدیت کا آئینہ ہے:

یونانی فکر کے عظیم ستون، یعنی افلاطون کے نزدیک وقت اِس مادی دنیا کی کوئی اتفاقی شے نہیں، بلکہ یہ ایک اعلیٰ اور لافانی حقیقت کا عکس ہے۔ اُس نے وقت کی نوعیت کو ایک نہایت لطیف استعارے میں ڈھالا ہے: "وقت ابدیّت کی ایک متحرّک تصویر ہے"۔[5]

---

[5] ٹیمائیس (Timaeus) از افلاطون۔

اِس تصور کی گہرائی میں اُتریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابدیت (Eternity) اپنی جگہ ساکن، مکمل اور غیر متبدّل ہے، جبکہ وقت اُس لافانی سچائی کا اِس فانی دنیا میں ایک متحرّک اظہار ہے۔ افلاطون ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ ہماری روزمرہ کی جدوجہد اور وقت کا تلاطم دراصل ایک عظیم تر اور مستحکم حقیقت کا محض ایک سایہ ہے۔ یہ نکتہ ہمیں یہ حوصلہ دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے عارضی پن میں بھی اُس لافانی ترتیب کا سراغ لگائیں، جس کا ہم حصہ ہیں۔

ارسطو—وقت اور حرکت کا گہرا رشتہ:

افلاطون کے برعکس ارسطو نے وقت کو تجرید کے بجائے مادی دنیا کے منطقی پیرائے میں دیکھا۔ اُس کے نزدیک وقت کا وجود براہِ راست حرکت اور تبدیلی کے وقوع پذیر ہونے سے جڑا ہوا ہے۔ ارسطو کا استدلال ہے کہ اگر کائنات میں ہر قسم کی جنبش تھم جائے، تو وقت کا تصور بھی معدوم ہو جائے گا۔

ارسطو کے نزدیک وقت دراصل "حرکت کی پیمائش" کا نام ہے۔[6] جہاں سینٹ آگسٹائن اُسے انسانی باطن میں تلاش کرتا ہے، وہاں ارسطو اُسے طبیعیات کے قوانین اور خارجی دنیا کے تغیر سے منسوب کر کے ایک معروضی (Objective) حیثیت عطا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ہمیں باور کراتا ہے کہ وقت کائنات کے مادّی ڈھانچے کا جزوِ لاینفک ہے، جو ہر تغیر کو ایک ترتیب اور حساب فراہم کرتا ہے۔

سینٹ آگسٹائن—وقت ہمارے شعور کے اندر ہے:

سینٹ آگسٹائن نے وقت کی تلاش میں اپنی نظریں کائنات کے اُفق سے ہٹا کر انسانی روح کے نہاں خانوں کی طرف موڑ دیں۔ اُس کا فلسفہ نفسیاتی اور وجودی ہے، جس کے مطابق وقت باہر کی دنیا میں موجود ہونے کے بجائے ہمارے "شعور کی وسعت" (Extension of Consciousness) ہے۔ اُس کے نزدیک وقت کا وجود روح کی ایک کیفیت اور اُس کا ایک گہرا انعکاس ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے مطابق وقت کی تقسیم ماضی، حال اور مستقبل میں یوں کی گئی ہے؛

1۔ ماضی: یہ دراصل ہمارے شعور میں موجود یاد (Memory) ہے۔

---

[6] تاریخِ فلسفہِ یونان، از ڈاکٹر نعیم احمد، علمی کتب خانہ لاہور۔

2۔ حال: یہ براہِ راست ادراک اور موجودہ تجربہ (Experience) ہے۔

3۔ مستقبل: یہ ہمارے ذہن میں موجود توقع یا اُمید (Expectation) ہے۔

آگسٹائن کا یہ سہ جہتی تصور روایتی فکر کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وقت کوئی ایسی لکیر نہیں، جس پر ہم چل رہے ہیں، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع میدان ہے، جو ہمارے اندر بسا ہوا ہے، جہاں ہم یادوں اور اُمیدوں کو حال کے ایک نقطے میں سمو لیتے ہیں۔[7]

بوئیتھیس-خدا کا ابدی لمحہ:

بوئیتھیس نے وقت کو ایک ماورائی اور ہمہ گیر زاویے سے دیکھنے کی دعوت دی۔ اُس کے مطابق انسانی نظر وقت کو ایک لکیر (Linear) کی طرح دیکھتی ہے، جس میں واقعات ایک تسلسل سے گزرتے ہیں، لیکن ایک بلند تر ہستی کے لیے یہ تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ اِس معیار کو "ابدی لمحہ" (Eternal Moment) قرار دیتا ہے، جہاں تمام زمانہ ایک اکائی بن جاتا ہے۔[8]

اِس تصور کے مطابق ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی منظر میں بیک وقت موجود ہیں۔ یہ "الوہی نقطۂ نظر" ہمیں تاریخ کے انتشار اور زندگی کے حوادث میں ایک پُراسرار سکون اور کائناتی نظم کا احساس دلاتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ جن کو ہم بکھرے ہوئے واقعات سمجھتے ہیں، وہ دراصل ایک وسیع تر اور مکمل تصویر کا حصہ ہیں، جو ایک ہی لمحے میں محیط ہے۔

قدیم فلسفے کے یہ دانش مندانہ اسباق ہمیں بتاتے ہیں کہ وقت محض گھڑی کی سوئیوں کی گردش نہیں، بلکہ یہ ابدیت کا پرتَو، کائنات کی حرکت کا میزان اور ہمارے شعور کی لامحدود وسعت ہے۔ اگرچہ فلسفہ صدیوں سے اِس کی گرہیں کھولنے میں مصروف ہے، مگر اِس کی اصل حقیقت آج بھی ایک مُقدّس راز کی طرح برقرار ہے، جسے پوری طرح الفاظ میں قید کرنا ناممکن ہے۔

---

[7] قرونِ وسطیٰ کا فلسفہ، از ڈاکٹر نعیم احمد، علمی کتب خانہ لاہور

[8] ایضاً

یہ سوال ہماری وجودی حقیقت کا محور ہے کہ کیا آپ اِس وقت اپنے "ماضی کی یادوں" کے اسیر ہیں، "مستقبل کی توقعات" کے سراب میں بھٹک رہے ہیں، یا واقعی اِس "حال کے تجربے" میں سانس لے رہے ہیں، جو زندگی کا واحد سچا لمس ہے؟

تیسرا باب

زمان و مکاں کی پُراسرار دنیا

وہ سائنسی حقائق، جو آپ کے ہوش اڑا دیں گے

اب ہم زمان و مکان کی سائنسی حقیقت اور اُن کے باہمی تعلق کی وضاحت پر بات کریں گے۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وقت مستقل نہیں، بلکہ دیکھنے والے کی رفتار کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ کوانٹم فزکس اور کاسمولوجی کے تناظر میں وقت کی ابتدا، اُس کے بہاؤ کی سمت اور خوردبینی سطح پر اُس کی غیر یقینی نوعیت پر غور کرنا مفید ہے۔ سٹیفن ہاکنگ اور کارلو رویلی جیسے ماہرین کی تحقیقات سے کائنات کی ریاضیاتی تشکیل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سائنس وقت کی پیمائش تو کر سکتی ہے، لیکن اُس کے حقیقی مفہوم کی مکمل تشریح اب بھی ایک معمہ ہے۔

وقت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسی ہموار اور مسلسل بہتی ہوئی ندی ہے، جس کا کوئی کنارہ نہیں، یا پھر یہ محض ایک ایسا سحر انگیز فریبِ نظر (Illusion) ہے، جس کی قید میں ہم سب گرفتار ہیں؟ ہم اپنی روزمرہ زندگی کی تگ و دو میں وقت کو گھڑی کی سوئیوں کی بے رحم ٹِک ٹِک میں قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جدید فزکس کی گہرائیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ وقت کا وہ ادراک، جو ہمیں حاصل ہے، حقیقتِ مطلق سے کوسوں دور ہے۔ اِس باب میں ہم سائنس اور فلسفے کے اِس سنگم پر کھڑے ہو کر زمان و مکاں (Space-time) کی اُن پرپیچ راہداریوں کا سفر کریں گے، جو انسانی شعور کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

وقت کوئی مطلق حقیقت نہیں(Relativity of Time):

بیسویں صدی کے آغاز میں البرٹ آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت (Relativity) کے ذریعے کائنات کے قدیم ترین ستون کو ہلا کر رکھ دیا۔ اُس نے ثابت کیا کہ وقت کوئی خود مختار یا مطلق (Absolute) حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ "زمان و مکاں کی پُراسرار بُنت" (Space-time Fabric) کا ایک حصہ ہے۔ آئن سٹائن کے مطابق زمان اور مکان ایک دوسرے میں اِس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ اُنہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وقت کی رفتار تغیر پذیر (Mutable) ہے۔ یہ مشاہدہ کرنے والے کی رفتار اور اُس پر اثر انداز ہونے والی کششِ ثقل (Gravity) کے تابع ہے۔ جوں جوں آپ کی رفتار روشنی کی رفتار کے قریب پہنچتی ہے، آپ کے لیے وقت کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے۔ یہ تصور ہماری روزمرہ زندگی کے تجربات کے اِس قدر برعکس ہے کہ انسانی عقل اِسے تسلیم کرنے سے کتراتی ہے، مگر کائناتی سچائی یہی ہے کہ "اب" کا کوئی عالمگیر وجود نہیں ہے۔ آئن سٹائن نے ایک موقع پر وقت کی اِس ماباوی حقیقت کو اِن الفاظ میں بیان کیا تھا: "ہم جیسے لوگ، جو فزکس پر یقین رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان فرق محض ایک ضد پر قائم رہنے والا وہم (Illusion) ہے"۔[9]

کوانٹم کی سطح پر وقت کی بے ترتیبی (Quantum Perspective):

جب ہم کائنات کی خوردبینی (Microscopic) دنیا یعنی ایٹموں اور سب ایٹمی ذرات کی سطح پر اُترتے ہیں، تو وقت کا تصور مزید دھندلا جاتا ہے۔ کوانٹم فزکس ہمیں بتاتی ہے کہ کائنات کی بنیادیں ویسی ہموار اور مسلسل (Continuous) نہیں ہیں، جیسی ہمیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ یہاں وقت غیر یقینی اور ٹکڑوں میں منقسم (Discontinuous) معلوم ہوتا ہے۔

سائنس دانوں کے مطابق ایک ایسا کم ترین وقت بھی موجود ہے، جسے "پلانک ٹائم" (Planck Time) کہا جاتا ہے۔[10] یہ وہ اکائی ہے، جس سے چھوٹا وقت کا کوئی وقفہ ممکن نہیں۔ اِس سطح پر وقت کسی

---

[9] یہ مشہور اقتباس دراصل کسی باقاعدہ کتاب سے نہیں، بلکہ اُس کے ایک تعزیتی خط سے لیا گیا ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ 1955ء میں آئن سٹائن کے قریبی دوست اور ساتھی طبیعیات دان مِشیل بیسو (Michele Besso) کا انتقال ہو گیا تھا۔ اِس موقع پر آئن سٹائن نے اُس کے خاندان کو ایک خط لکھا۔ اُسی خط میں اُس نے وقت کے بارے میں یہ جملہ لکھا: "For us believing physicists, the distinction between past, present and future is only a stubbornly persistent illusion."۔ بعد ازاں یہ خط آئن سٹائن کے خطوط کے مجموعوں میں شائع ہوا۔

[10] طبیعیات میں پلینک ٹائم (Planck Time) اُس انتہائی مختصر ترین وقت کو کہا جاتا ہے، جسے موجودہ طبیعی نظریات کے مطابق معنی خیز طور پر ماپا جا سکتا ہے۔ یہ تقریباً (5.39 \times 10^{-44}) سیکنڈ کے برابر ہے۔ اِس تصور کو جرمن طبیعیات دان میکس پلینک (Max Planck) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، جس نے طبیعیات میں بنیادی مستقلات (جیسا کہ روشنی کی رفتار، کششِ ثقل کا مستقل، اور پلانک مستقل) کی بنیاد پر قدرتی اکائیوں کا نظام پیش کیا۔ نظری طور پر یہی وہ لمحہ ہے، جو کائنات کے آغاز (Big Bang) کے فوراً بعد کا ابتدائی ترین قابلِ تصور وقت سمجھا جاتا ہے، جس سے پہلے کے حالات کو بیان کرنے کے لئے ابھی تک مکمل طبیعی نظریہ (خصوصاً کوانٹم گریویٹی) موجود نہیں۔

بہتی ہوئی ندی کے بجائے بکھرے ہوئے دانوں کی مانند برتاؤ کرتا ہے۔ یہ حقیقت اِس بات کی غماز ہے کہ کائنات کا بنیادی ڈھانچہ ہماری ظاہری بصارت سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مبہم ہے۔

وقت کا تیر اور اینٹروپی (The Arrow of Time and Entropy):

کاسمولوجی (Cosmology) کا ایک بڑا معمہ "وقت کا تیر" (Arrow of Time) ہے۔ سوال یہ ہے کہ وقت ہمیشہ ماضی سے مستقبل کی طرف ہی کیوں سفر کرتا ہے؟ اِس کا جواب تھرموڈائنامکس (Thermodynamics) کے قانون "اینٹروپی" (Entropy) میں پوشیدہ ہے۔ اینٹروپی دراصل کائنات میں بڑھتی ہوئی بے ترتیبی (Disorder) کا نام ہے۔[11]

وقت کا ایک ہی سمت میں بہاؤ اِس لیے ہے، کیونکہ ہماری کائنات کا آغاز (Big Bang) انتہائی منظم حالت، یعنی انتہائی کم اینٹروپی سے ہوا تھا۔ سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) جیسے سائنسدانوں نے بگ بینگ سے پہلے کے وقت پر یہ کہہ کر سوال اٹھایا کہ یہ سوال ہی بے معنی ہے، بالکل ویسے ہی، جیسے "قطبِ شمالی سے مزید شمال میں کیا ہے؟" کا سوال۔ وقت کی سمت کا تعین کائنات کا یہی پھیلاؤ اور بڑھتی ہوئی بے ترتیبی کرتی ہے، جس کی وجہ سے ہم ماضی کو تو یاد رکھ سکتے ہیں، مگر مستقبل کو نہیں۔

ریاضی بمقابلہ معنی (Mathematics vs. Meaning):

جدید فزکس، خاص طور پر کارلو روویلی (Carlo Rovelli) جیسے مفکرین کے کام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کائنات کی بنیادی مساواتوں میں وقت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ریاضی کی کئی مساواتوں میں متغیر "t"

---

[11] طبیعیات میں وقت کا تیر (Arrow of Time) اِس تصور کو ظاہر کرتا ہے کہ وقت ایک خاص سمت میں آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یعنی ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف۔ اِس تصور کو عموماً اینٹروپی (Entropy) کے قانون سے جوڑا جاتا ہے، جو حراریات کے دوسرے قانون (Second Law of Thermodynamics) کے مطابق یہ بتاتا ہے کہ بند نظام میں بے ترتیبی یا انتشار (entropy) وقت کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اِسی اصول کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے طبیعی اعمال صرف ایک سمت میں واقع ہوتے ہیں، جیسے کسی ٹوٹی ہوئی چیز کا خود بخود دوبارہ درست نہ ہو جانا۔ اِس نظریے کی سائنسی بنیادوں کی وضاحت میں متعدد طبیعیات دانوں نے کام کیا، جن میں نمایاں طور پر "Arthur Eddington" نے "Arrow of Time" کی اصطلاح کو رائج کیا، جبکہ اینٹروپی کے نظریے کی بنیاد آسٹریائی طبیعیات دان "Ludwig Boltzmann" کے شماریاتی میکانیات (Statistical Mechanics) کے کام سے وابستہ ہے۔

(وقت) کو اُلٹا بھی کر دیا جائے تو حساب درست رہتا ہے۔ یعنی کائنات کی ریاضیاتی زبان میں ماضی اور مستقبل کی تمیز مٹ جاتی ہے۔

مگر یہاں سائنس اور انسانی معنی (Meaning) میں تصادم پیدا ہوتا ہے۔ جہاں ریاضی وقت کو محض ایک عدد یا متغیر کے طور پر دیکھتی ہے، وہاں ایک انسان کے لیے وقت "وجود" کی بنیاد ہے۔ ریاضی کی مساواتوں میں وقت آگے پیچھے ہو سکتا ہے، مگر انسانی دل کے نہاں خانوں میں یادیں، پچھتاوے اور اُمیدیں صرف ایک ہی سمت میں سفر کرتی ہیں۔ سائنس ہمیں یہ تو بتا سکتی ہے کہ وقت کیسے گزرتا ہے، مگر وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ایک لمحے کا ضیاع انسانی روح پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ وقت کا سائنسی ادراک اور اُس کا انسانی احساس دو بالکل الگ دنیائیں ہیں۔

زمان و مکاں کی اِس سحر انگیز بساط پر ہم نے یہ جانتے کہ وقت لچکدار ہے، یہ مکان کے ساتھ جُڑا ہوا ہے، کوانٹم کی سطح پر یہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے اور شاید کائنات کی بنیادی سطح پر یہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ جدید سائنس وقت کو ایک "اُبھرتی ہوئی حقیقت" (Emergent Property) قرار دیتی ہے، جو شاید بنیادی سطح پر موجود نہ ہو، مگر بڑے پیمانے پر ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ اِس سائنسی بحث کے بعد ایک گہرا فکری سوال ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے کہ اگر وقت کائنات کی کوئی بنیادی حقیقت نہیں، بلکہ محض ایک ریاضیاتی دھوکہ یا اضافی ترتیب ہے، تو پھر اُن لمحوں، یادوں اور جذبوں کی کیا حیثیت ہے، جو ہماری زندگی کا حاصل ہیں؟ کیا ہم محض ایک ایسے فریبِ نظر میں جی رہے ہیں، جہاں ہمارا ماضی کہیں گم نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ کے لیے کائنات کے کسی گوشے میں محفوظ ہے؟

چوتھا باب

وقت کی الٰہی ترتیب

عہد نامہِ قدیم سے حاصل ہونے والے حیران کن حقائق

اب ہم عہد نامہِ قدیم میں وقت کے مذہبی تصور اور اُس کی ترتیب کا ایک جامع خلاصہ بیان کریں گے۔ بنیادی طور پر "مقرّرہ وقت" کا نظریہ انسانی زندگی میں خدا کے کیے گئے وعدوں کی تکمیل کو ظاہر کرتا ہے۔ نبوّت میں وقت کی رفتار سطری (Linear) ہے، جو کائنات کی تخلیق سے شروع ہو کر اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتی ہے۔ اگرچہ الٰہی اور انسانی وقت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن یہ آپس میں گہرے طور پر جُڑے ہوئے ہیں۔ مُقدّس متون میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ وقت اور زمانوں کو تبدیل کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ تمام واقعات ایک مخصوص اور الٰہی حکمت کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

تاہم سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر "وقت ہے کیا؟" کیا یہ محض ایک اتفاقی تسلسل ہے، جو بے مقصد بہتا جا رہا ہے، یا وہ عظیم کینوس ہے، جس پر "مصوّرِ ازل" اپنے ارادوں کے رنگ بھر رہا ہے؟ انسانی عقل اکثر وقت کو ایک بے رحم قید خانہ تصور کرتی ہے، لیکن عہد نامہِ قدیم (Old Testament) کا الٰہیاتی مطالعہ ہمیں ایک بالکل مختلف مابعد الطبیعیاتی تناظر فراہم کرتا ہے۔ یہاں وقت محض گھڑی کی سوئیوں کی گردش کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسی الٰہی ترتیب ہے، جہاں ہر لمحہ ایک خاص مقصد کے تحت وقوع پذیر ہوتا ہے۔

"مقرّرہ وقت" کا تصور اور الٰہی مداخلت:

الٰہی نظامِ اوقات میں ایک بنیادی تصور "مقرّرہ وقت" (Appointed Time) کا ہے۔ یہ تصوّر انسانی وقت (Chronos) اور الٰہی وقت (Kairos) کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے۔ انسانی پیمانے پر جب حالات نااُمید اور مٹ چکے ہوتے ہیں، وہاں الٰہی "مقرّرہ وقت" اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اِس کی سب سے بڑی مثال ابراہام اور سارہ کی زندگی ہے، جہاں انسانی طور پر تمام امکانات ختم ہو جانے کے باوجود عین اُسی لمحے اولاد کی خوشخبری ملی، جو خدا نے طے کر رکھا تھا۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ انسانی

عجز اور الٰہی وعدے کے درمیان جو خلیج ہے، اُسے صرف "انتظارِ صادق" سے پُر کیا جا سکتا ہے: "کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے؟ موسمِ بہار میں عین وقت پر میں تیرے پاس آؤں گا، اور سارہ کے بیٹا ہو گا" (دیکھئے: پیدائش 14:18)۔

وقت ایک خطِ مستقیم ہے، دائرہ نہیں:

مشہور الٰہیاتی مفکر گیرہارڈ فان راڈ (Gerhard von Rad) اِس نکتے پر زور دیتا ہے کہ نبوّت کے تناظر میں وقت کی نوعیت "سطری" (Linear) ہے۔[12] بہت سی قدیم تہذیبوں کے برعکس، جو وقت کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دائرہ (Circular Time) سمجھتی تھیں، عہد نامہِ قدیم کا پیغام یہ ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز (تخلیق) تھا اور اِس کا ایک عظیم الشان انجام (خداوند کا دن) ہے۔ وقت کا یہ تصوّر انسانی زندگی کو ایک خاص سمت اور بے پناہ اہمیت عطا کرتا ہے۔ جب وقت دائرہ نہیں، بلکہ ایک راستہ ہے، تو اُس کا ہر لمحہ منفرد اور ناقابلِ واپسی بن جاتا ہے، جس سے ہر انسانی عمل پر ایک ابدی وزن اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

زمان و مکاں پر خدا کی حاکمیت:

انسان وقت کی قید میں ہے، وہ ماضی کو بدل سکتا ہے، نہ مستقبل کو اپنی مرضی سے ڈھال سکتا ہے۔ اِس کے برعکس خدا وقت کا خالق اور اُس پر مکمل حاکمیت رکھنے والا ہے۔ دانی ایل 2:21 میں انسانی بے بسی اور الٰہی حاکمیت (Sovereignty) کا موازنہ نہایت بصیرت افروز طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہاں خدا کو محض وقت کا ناظر نہیں، بلکہ اُسے تبدیل کرنے والا (Changer of Times and Seasons) پیش کیا گیا ہے۔ یہ الٰہی قدرت انسان کو یہ اطمینان دلاتی ہے کہ تاریخ کا رُخ کسی اندھے اتفاق کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے، جو زمانوں کو اُلٹ پلٹ کرنے کی قدرت رکھتی ہے: "وہی وقتوں اور زمانوں کو تبدیل کرتا ہے، وہی بادشاہوں کو معزول اور قائم کرتا ہے، وہی حکیموں کو حکمت اور دانشمندوں کو دانش عنایت کرتا ہے" (دیکھئے: دانی ایل 2:21)۔

---

[12] الٰہیاتِ عہدِ قدیم (Old Testament Theology)۔

انتظار کی الٰہیاتی حکمت:

انسانی فطرت میں عجلت پسندی شامل ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اکثر الٰہی منصوبوں میں "تاخیر" کا گمان ہوتا ہے۔ تاہم حبقوق 2:3 ہمیں یہ گہرا الٰہیاتی نکتہ سمجھاتی ہے کہ جسے ہم تاخیر سمجھتے ہیں، وہ دراصل الٰہی حکمت کی تکمیل کا ایک مرحلہ ہے۔ خدا کا وقت انسانی خواہشات کا پابند نہیں، بلکہ اُس کے اپنے کامل ارادے کے تابع ہے۔ انتظار کے یہ لمحات بے مقصد نہیں ہوتے، بلکہ یہ انسانی ایمان کی پختگی اور الٰہی جلال کے ظہور کا پیش خیمہ ہوتے ہیں: "کیونکہ یہ رویا ایک مقررہ وقت کے لئے ہے" (دیکھئے: حبقوق 2:3)۔

عہد نامہِ قدیم کی الٰہیاتی بصیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ کائنات کی گھڑی محض اتفاق سے نہیں چل رہی، بلکہ اِس کا ایک ایک ثانیہ (سیکنڈ) الٰہی ترتیب کا مرہونِ منت ہے۔ ابراہام کے صبر سے لے کر دانی ایل کی رویا تک ہر واقعہ اِس سچائی کی گواہی دیتا ہے کہ وقت کی ہر لہر ایک عظیم مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔

آج جب آپ خود کو وقت کی بے رحمی یا انتظار کی طوالت میں گھرا ہوا محسوس کریں تو رُک کر سوچیں کہ کیا آپ اِن لمحات کو ایک عام انسان کی طرح دیکھ رہے ہیں یا اُس خالق کے تناظر میں، جس کے قبضے میں تمام زمانے ہیں؟ یاد رکھیں! آپ کا انتظار کسی خلا میں نہیں، بلکہ اُس ہستی کی آغوش میں ہے، جو وقت کا تخلیق کار ہے۔ اپنے دل کو اِس یقین سے منور کریں کہ جب گھڑی کی سوئیاں اُس کے طے شدہ لمحے پر پہنچیں گی، تو وہی ہو گا، جو برحق ہے، کیونکہ وہی "مالکِ وقت" ہے اور اُس کا ہر فیصلہ عین حکمت ہے۔

پانچواں باب

وقت کی تکمیل

تجسّم و تصلیب اور تاریخ کا بدلتا ہوا رُخ

آسکر کولمین بائبل کے تناظر میں وقت کی تکمیل اور مسیح کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ مختلف انجیلی حوالوں کے ذریعے یہ واضح کرتا ہے کہ یسوع مسیح کی آمد محض ایک تاریخی واقعہ نہیں، بلکہ الٰہی منصوبے کا مرکزی نقطہ ہے۔ وہ یوحنا اور مرقس کی آیات کا سہارا لیتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ کس طرح مسیح کی زندگی اور صلیب کا واقعہ وقت کے صحیح تعین کو ظاہر کرتے ہیں۔ الفا اور اومیگا کی اصطلاح یہ پیغام دیتی ہے کہ کائنات کا آغاز اور انجام دونوں ذاتِ مسیح میں سمٹ آئے ہیں، اور خدا کی بادشاہی کا قیام وقت کے ایک خاص اور مقدّس مرحلے پر ہوتا ہے۔

انسانی شعور ازل سے وقت کی پُراسرار حقیقت کو سمجھنے کی جستجو میں رہا ہے۔ کیا انسانی تاریخ محض حوادث کا ایک بے ربط تسلسل اور گزرتے ہوئے ایام کا بے روح مجموعہ ہے، یا اِس کا کوئی خاص مرکز اور ابدی مقصد بھی ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جو صدیوں سے فلسفیوں اور الٰہیات دانوں کے لیے فکر کا محور رہا ہے۔

مایہ ناز الٰہیات دان آسکر کولمین (Oscar Cullmann) اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مسیح اور زماں"(Christ and the Time) میں اِسی گتھی کو سلجھاتے ہوئے یہ بصیرت افروز نظریہ پیش کرتا ہے کہ مسیحی فکر میں وقت محض ایک لکیری بہاؤ نہیں، بلکہ ایک ایسا نقشہ ہے، جس کا مرکز اور معانی یسوع مسیح کی ذات سے عبارت ہیں۔ کولمین کے نزدیک تاریخِ نجات (Salvation History) کا ہر لمحہ مسیح کی آمد کے اُس عظیم "وسط" کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، جس نے وقت کے دھارے کو ہمیشہ کے لیے ایک نئی سمت عطا کر دی ہے۔

وقت کی معموری۔ "کرونوس" اور "کائروس" کا سنگم:

مُقدّس پولس جب مسیح کی آمد کا ذکر کرتا ہے، تو وہ اُسے محض ایک تاریخی واقعہ نہیں، بلکہ "وقت کی تکمیل"(Fullness of Time) قرار دیتا ہے۔ یہاں ہمیں یونانی تصورِ زماں کے دو اہم پہلوؤں کو سمجھنے

کی ضرورت ہے: ایک "کرونوس"(Chronos)، یعنی "وہ عددی وقت، جو گھڑی کی ٹِک ٹِک کے ساتھ گزر رہا ہے"، اور دوسرا "کائروس"(Kairos)، یعنی "وہ مُقدّس یا مقرّرہ گھڑی، جو کسی عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے مخصوص ہوتی ہے"۔

گلتیوں4:4 میں جس وقت کا ذکر ہے، وہ خدا کی مشیّتِ ایزدی کے تحت تاریخ کا وہ لبریز پیمانہ تھا، جہاں تمام سیاسی، مذہبی اور سماجی حالات اپنے نقطہِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ یہ محض ایک حادثہ نہیں تھا، بلکہ تاریخ کا وہ لمحہ تھا، جب ابدیت نے وقت کی حدود میں قدم رکھا: "لیکن جب وقت پورا ہو گیا تو خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا، جو عورت سے پیدا ہوا، اور شریعت کے ماتحت پیدا ہوا" (دیکھئے: گلتیوں4:4)۔

بادشاہی کا اعلان اور تاریخ کا انقلابی موڑ:

اناجیل میں مسیح کی منادی کا آغاز ہی وقت کے ایک بڑے اور انقلابی اعلان سے ہوتا ہے۔ مرقس 15:1 کے مطابق مسیح نے جب اپنی خدمت کا بیڑا اُٹھایا تو واضح کیا کہ اب انتظار کی صدیاں ختم ہوئیں، اور "کائروس"، یعنی وہ مقررہ وقت آ پہنچا ہے، جس کا انبیاء نے وعدہ کیا تھا۔ خدا کی بادشاہی کا "قریب آنا" اِس بات کی علامت تھا کہ انسانی تاریخ اب اپنے پرانے ڈھنگ پر نہیں چل سکتی۔ یہ ایک ایسا انقلابی موڑ تھا، جہاں خدا کا ابدی اقتدار انسانی وقت کے اندر داخل ہو کر اُسے تقدّس بخش رہا تھا۔ مسیح کا یہ اعلان تاریخ کے رُخ کو موڑنے والا ایک ایسا دعویٰ تھا، جس نے "وقت" کو محض گزرنے والی چیز کے بجائے ایک "فیصلہ کُن لمحہ" بنا دیا۔

"میرا وقت" یعنی تصلیب—تاریخ کا نقطہِ عروج:

یوحنا کی انجیل کا مطالعہ کریں تو ہمیں وقت کے حوالے سے ایک گہرا الٰہیاتی تضاد نظر آتا ہے، جو مسیح کی زندگی کے مقصد کو واضح کرتا ہے۔ اپنی خدمت کے ابتدائی دَور میں مسیح بارہا یہ کہتا ہے کہ "ابھی میرا وقت نہیں آیا" (یوحنا6:7)۔ لیکن جیسے ہی تصلیب کا مرحلہ قریب آتا ہے، اُس کے لب و لہجے میں ایک حتمی یقین پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اعلان کرتا ہے کہ "اب وقت آ گیا ہے" (یوحنا12:23)۔ یہ تضاد اِس حقیقت کی عکّاسی کرتا ہے کہ مسیح کی پوری حیاتِ مبارکہ ایک خاص مقصد یعنی تاریخ کے اُس نقطہِ عروج کی طرف بڑھ

رہی تھی، جہاں انسانیت کی نجات کا قرض ادا ہونا تھا۔ صلیب وہ مقام ہے، جہاں وقت کا محور بدل گیا۔ یہ وہ "وسط" ہے، جس سے پہلے کی تمام تاریخ "انتظار" تھی، اور اِس کے بعد کی تمام تاریخ "تکمیل" کی خوشخبری ہے۔

ابتدا اور انتہا کا محیط–الفا اور اومیگا:

کلامِ مُقدّس کی آخری کتاب "مکاشفہ" میں وقت کے اِس تصور کو کائناتی وسعت عطا کی گئی ہے۔ یہاں مسیح کو "الفا اور اومیگا" کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یعنی وہ ہستی، جو تاریخ کی ابتدا اور انتہا کو اپنے محیط میں لیے ہوئے ہے۔

یہ تصور واضح کرتا ہے کہ مسیح وقت کا قیدی نہیں، بلکہ اُس کا حاکم ہے۔ اُس میں تاریخ کا آغاز (تخلیق) اور اُس کا انجام (تکمیل) یکجا ہو جاتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ بے سمت یا دائروں میں بھٹکتی ہوئی کوئی کہانی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عظیم منزل کی طرف گامزن ہے، جس کا ضامن خود مسیح ہے: "خداوند خدا، جو ہے، اور جو تھا، اور جو آنے والا ہے۔ یعنی قادرِ مطلق فرماتا ہے کہ میں الفا اور اومیگا ہوں" (مکاشفہ 8:1)۔

مسیح کی آمد نے وقت کو محض دو حصوں (ق۔م اور عیسوی) میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ اِسے معانی بھی عطا کیے ہیں۔ تاریخ اب محض واقعات کا ڈھیر نہیں رہا، بلکہ ایک مربوط داستانِ نجات ہے، جس کا مرکز و محور مسیح کی ذات ہے۔ اُس کی آمد سے وقت کی تکمیل ہوئی، اُس کے اعلان سے خدا کی بادشاہی کا عہد شروع ہوا، اور اُس کی صلیب نے تاریخ کو ایک مقصد عطا کیا۔ آج جب ہم اپنی زندگیوں کے بدلتے ہوئے حالات اور گزرتے ہوئے ایام کی بے ثباتی پر غور کرتے ہیں، تو یہ سوال ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے کہ اگر کائنات کی پوری تاریخ کا مرکز مسیح ہے، تو کیا ہماری زندگی کا "وقت" بھی اِسی مرکز کے گرد گھوم رہا ہے، یا ہم ابھی تک بے سمت وقت کے دھارے میں بہہ رہے ہیں؟

چھٹا باب

وقت اور ابدیت کا سنگم

یسوع مسیح کے بارے میں وہ حقائق، جو آپ کی سوچ بدل دیں گے

ولف ہارٹ پینن برگ کے الٰہیاتی تصورات میں یسوع مسیح کو وقت اور ابدیت کے درمیانی نقطے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تجسّم کا عمل اُس وقت شروع ہوا، جب ایک ابدی ہستی انسانی تاریخ کے مادی زمانے میں داخل ہوئی۔ صلیب اور قیامت کے واقعات کو ایسے کائناتی سنگ ہائے میل قرار دیا گیا ہے، جو وقت کی قید کو ختم کر کے انسان کو لازوال زندگی سے جوڑتے ہیں۔ اُس کے مطابق مسیح کی زندگی تاریخ کا وہ کلیدی لمحہ ہے، جہاں دنیاوی نظام اور الٰہی ابدیت آپس میں ملتے ہیں۔ مختلف انجیل کے حوالہ جات اِس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسیح کا ظہور ایک مقررہ الٰہی منصوبے کا حصہ تھا۔ یوں مسیح کائنات کے زمانی و مکانی مرکز کے طور پر سامنے آتا ہے۔

وقت کی قید اور ابدیت کی پکار:

انسانی وجود کی بساط زمان و مکاں کے تانے بانے سے بنی گئی ہے۔ ہم "وقت کے جبر" تلے دبے وہ اسیر ہیں، جو ثانیوں، دقیقوں اور برسوں کے ایک ایسے تسلسل میں مقید ہیں، جسے ہم "تاریخ" کا نام دیتے ہیں۔ اِس کے باوجود، انسانی روح کے نہاں خانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسی پکار گونجتی رہی ہے، جو وقت کی تنگ و تاریک حدود سے نکل کر لافانیت اور ابدیت کے وسیع و عریض اُفق کو چھونا چاہتی ہے۔ فانی انسان اور لافانی خدا کے درمیان یہ تضاد فکرِ انسانی کا قدیم ترین معمہ رہا ہے۔ تاہم مسیحی الٰہیات کے عمیق مشاہدے میں ایک ایسا مقامِ اتصال موجود ہے، جہاں یہ دونوں متوازی لکیریں باہم بغل گیر ہوتی ہیں۔

تجسّم—جب ابدی خدا وقت کی حدود میں داخل ہوا:

مسیحی فکر میں "تجسّم" (Incarnation) وہ محیر العقول نکتہ ہے، جہاں "لامکاں" نے "مکاں" کی حدود میں قدم رکھا اور "ازل" نے "وقت" کا پیرہن زیبِ تن کیا۔ اِس کا عمیق مفہوم یہ ہے کہ وہ ہستی، جو

بذاتِ خود وقت کی خالق اور ہر مادی قید سے منزّہ ہے، تاریخ کے ایک مخصوص جغرافیائی اور زمانی لمحے کا حصہ بن گئی۔ وہ کلام، جو وقت کی تخلیق سے پیشتر موجود تھا، بشریت کے لبادے میں وقت کی قید میں آ گیا: "کلام مجسم ہوا" (یوحنا 1:14)۔

یہ حقیقت ورطہِ حیرت میں ڈال دینے والی ہے کہ خالقِ کائنات نے خود کو رضاکارانہ طور پر وقت کے فریم میں محدود کر لیا۔ اِس تجسّم نے وقت کی ماہیت کو تبدیل کر دیا ہے۔ اب وقت محض گزرتے ہوئے بے جان لمحات کا نام نہیں رہا، بلکہ یہ ابدی خدا کی حضوری کا گہوارہ بن چکا ہے۔ جب خدا وقت کے دھارے میں شامل ہوا، تو اُس نے ہر گزرتے لمحے کو ابدیت کے لمس سے مقدّس کر دیا۔

صلیب–تاریخ کا وہ لمحہ، جس کی حیثیت کائناتی ہے:

صلیب کا واقعہ محض دو ہزار سال قبل پیش آنے والا کوئی اتفاقی حادثہ یا محض ایک سیاسی المیہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک "کائناتی لمحہ" (Cosmic Moment) ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں پوری انسانی تاریخ کا محور تبدیل ہو جاتا ہے۔ بائبل مقدّس اِس بات پر زور دیتی ہے کہ مسیح کی قربانی کسی ناگہانی صورتحال کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ یہ ایک ازلی و ابدی الٰہی منصوبے کی تکمیل تھی۔ رومیوں 5:6 کے مطابق مسیح "مقرّرہ وقت" پر بے دینوں کے لیے مرا۔

یہ "مقرّرہ وقت" دراصل وہ کلیدی نکتہ ہے، جہاں ماضی کے تمام وعدے، حال کی ضرورتیں اور مستقبل کی تمام اُمیدیں آ کر پیوست ہو جاتی ہیں۔ صلیب کا واقعہ وقت کے دھارے میں ایک ایسی دراڑ پیدا کرتا ہے، جو ماضی کے گناہوں کا کفارہ بن کر مستقبل کی ابدی زندگی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یہ وہ "گھڑی" ہے، جس کا اثر کائنات کی ہر شے اور تاریخ کے ہر ورق پر محیط ہے۔

قیامت–وقت کی زنجیروں کا ٹوٹ جانا:

اگر تجسّم ابدیت کا وقت میں نزول تھا، تو قیامت (Resurrection) وقت کا ابدیت میں فاتحانہ عروج ہے۔ انسانی تاریخ کا مروّجہ قانون یہ ہے کہ ہر زندگی "آغاز" سے "انجام" کی طرف گامزن ہے، جہاں

موت وقت کی آخری حد یا وہ آہنی زنجیر ہے، جسے کوئی توڑ نہیں سکا۔ مسیح کے جی اٹھنے نے "تخلیقِ نَو" کا مژدہ سنا کر اِس زنجیر کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا۔

یوحنا 17:1 میں مسیح نے کہا: "اب وقت آ گیا ہے"۔ یہ وہ مخصوص ساعت تھی، جب وقت اور ابدیت کے ٹکراؤ نے موت کی فرسودہ سرحدوں کو مٹا دیا۔ مسیح کی قیامت نے ثابت کر دیا کہ ابدیت نے موت پر (جو کہ وقت کی آخری حد ہے) کامل فتح پا لی ہے۔ اب انسان کے لیے وقت محض قبر تک کا سفر نہیں رہا، بلکہ یہ ابدی زندگی میں داخلے کی ایک تمہید بن چکا ہے۔

مسیح—زمان و مکاں کا حقیقی مرکز:

نامور جرمن فلسفی اور الٰہیات دان وولف ہارٹ پینن برگ (Wolfhart Pannenberg) کے نزدیک یسوع مسیح تاریخ اور ابدیت کے درمیان وہ "کلیدی لمحہ" (Key Moment) ہے، جو پوری تاریخ کو معنویت عطا کرتا ہے۔ پینن برگ کا نظریہ ہے کہ تاریخ کا اصل انجام مسیح کی ذات میں تاریخ کے درمیان ہی میں ظاہر ہو گیا ہے۔

مسیح کو تاریخ کا مرکز تسلیم کرنے سے ہماری زندگی کا زاویہ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ اب محض حادثات کا کوئی بے ترتیب مجموعہ یا لامتناہی چکر نہیں رہی، بلکہ یہ ایک بامقصد سفر ہے، جو اپنے حقیقی مرکز یعنی مسیح کی طرف گامزن ہے۔ جب ہم مسیح کو زمان و مکاں کا محور مان لیتے ہیں تو ہماری انفرادی زندگی کا ہر لمحہ ابدیت کے وسیع تناظر میں ایک عظیم الشان اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ یسوع مسیح کی زندگی، اُس کی مصلوبیت اور اُس کا جی اٹھنا وہ ابدی حقائق ہیں، جنہوں نے وقت کے فلسفے کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا ہے۔ وہ وقت اور ابدیت کے اُس سنگم پر کھڑا ہے، جہاں انسانی تاریخ کا ہر لمحہ ابدیت کے لمس سے معمور ہو جاتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کا مشاہدہ مسیح کے آئینے میں کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا کوئی بھی لمحہ بے مقصد نہیں ہے، بلکہ ہر گھڑی ابدیت کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم ہے۔

آج وقت کا ہر لمحہ ابدیت سے جڑا ہوا ہے اور ہماری زندگی کی ہر جنبش اُس بڑے کائناتی منصوبے کا حصہ ہے۔ اگر وقت کا ہر لمحہ ابدیت سے جڑا ہے، تو آپ آج کے دن کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ساتواں باب

وقت اور خدا

روایتی الٰہیات کے چند حیرت انگیز پہلو

عام روایتی الٰہیات میں خدا کو وقت کی قید سے آزاد مانا گیا ہے۔ سینٹ آگسٹائن، تھامس اکویناس اور جان کیلون جیسے مابعد الطبیعیاتی مفکرین کے مطابق باری تعالیٰ کا علم اور وجود ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق سے بالاتر ہے۔ اُسے "ابدی اَب" (Eternal Now) کا نام دیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ خدا ایک ہی لمحے میں تمام زمانوں پر محیط ہے۔ تاہم اِس نقطہِ نظر میں ایک علمی خامی موجود ہے، کیونکہ یہ نظریہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایک بہت بڑا فاصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ آیئے! اِس نظریے کو اِس کے بنیادی ماخذ کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وقت کی قید اور خالق کی ازلیت:

کیا آپ نے کبھی اِس مابعد الطبیعیاتی گتھی پر غور کیا ہے کہ وقت، جو ہماری زندگی کے ہر سانس اور ہر لمحے کو سیکنڈوں اور منٹوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے، اپنے خالق کے لیے کیا معنی رکھتا ہے؟ ہم فانی انسان تو ماضی کی حسرتوں اور مستقبل کے اندیشوں کے درمیان معلق ہیں، لیکن وہ ہستی، جس نے "زمان و مکاں" کی بساط بچھائی، وہ اِس حقیقت کا تجربہ کس طرح کرتی ہے؟ کیا خدا بھی ہماری طرح "انتظار" کرتا ہے، یا اُس کے ہاں "لمحہِ گُزراں" کی کوئی حیثیت نہیں؟

پہلا نکتہ — سینٹ آگسٹائن کا "ابدی اَب" (Eternal Now):

سینٹ آگسٹائن نے اپنی شہرہِ آفاق تصنیف "شہرِ خدا" (De Civitate Dei) میں وقت کی ماہیت پر جو بحث کی ہے، وہ آج بھی الٰہیاتی فکر کا ستون سمجھی جاتی ہے۔ آگسٹائن کے نزدیک خدا کے لیے "ماضی" یا "مستقبل" جیسی کوئی اصطلاح وجود نہیں رکھتی۔ انسانی نقطہِ نظر سے تاریخ ایک پھیلتا ہوا نقشہ ہے، لیکن خدا کے لیے یہ تمام تر جزئیات کے ساتھ ایک نقطے پر مرکوز ہے۔ اُس کا ادراک کسی گزرتی ہوئی فلم کی

مانند نہیں، بلکہ ایک ساکن تصویر کی طرح ہے، جہاں آغاز اور انجام ایک ہی لمحے میں موجود ہیں۔ خدا کے لیے وقت کوئی تغیر پذیر لہر نہیں، بلکہ ایک "سرمدی موجودگی" ہے، جہاں گزر چکا کل اور آنے والا کل، دونوں ایک دائمی اور غیر متبدل "حال" میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

اِس تصور کی گہرائی تاریخ کے حوالے سے ہمارے فہم کو بدل دیتی ہے۔ اگر خدا کے لیے سب کچھ "اَب" ہے، تو انسانی تاریخ کوئی ارتقائی سفر نہیں، بلکہ ایک مستقل نقشہ ہے، جو اُس کی نظر کے سامنے ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔

دوسرا نکتہ–ماورائے زماں وجود (Existence Beyond Time):

اینسلم اور تھامس اکویناس نے اِس تصور کو مزید منطقی بنیادیں فراہم کیں۔ اکویناس نے اپنی شاہکار تصنیف "Summa Theologica" میں وضاحت کی ہے کہ خدا "لازمانی" (Timeless) ہے۔ اکویناس کے نزدیک ابدیت محض طویل وقت کا نام نہیں، بلکہ وقت سے مکمل آزادی کا نام ہے، اور وہ اِسے "interminabilis vitae tota simul et perfecta possession" کہتا ہے، یعنی "ایک لامتناہی زندگی کا بیک وقت کامل اور ہمہ گیر قبضہ"۔

اکویناس اِسے ایک مشہور تمثیل سے سمجھاتا ہے: "تصور کریں کہ وقت ایک بہتا ہوا دریا ہے، جس میں انسان تیر رہے ہیں۔ ہم صرف اپنے اِرد گرد کے پانی کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن خدا اِس دریا کے کنارے، ایک بلند پہاڑ پر کھڑا ہے، جہاں سے وہ پورے دریا کے بہاؤ، اِس کے منبع اور اِس کے اختتام کو بیک وقت دیکھ رہا ہے۔ یہ "بساطتِ الٰہیہ" (Divine Simplicity) کا وہ مقام ہے، جہاں خدا کی ذات ہر قسم کے تغیر سے پاک ہے، کیونکہ تبدیلی کے لیے وقت کی ایک لمحے سے دوسرے لمحے میں منتقلی ضروری ہے، جبکہ خدا "حالتِ سکون" میں کامل ہے۔

تیسرا نکتہ–الٰہی علم اور زمانوں کی وسعت:

جان کیلون نے اپنی تصنیف "Institutes of the Christian Religion" میں اِس بحث کو خدا کے علم اور حاکمیت سے جوڑا ہے۔ کیلون کا مؤقف ہے کہ خدا کا علم محض "پیش گوئی" نہیں ہے، بلکہ اُس

کی ہستی (Being) تمام زمانوں پر اِس طرح محیط ہے کہ اُس کے ہاں منصوبہ بندی اور تکمیل کے درمیان کوئی زمانی فاصلہ نہیں۔

انسانی سطح پر ہم پہلے ارادہ کرتے ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ اُسے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن کیلون کے نزدیک خدا کے ہاں "ارادہ" اور "وقوعہ" کے درمیان کوئی زمانی خلا نہیں ہے۔ یہ نکتہ "تقدیر" (Predestination) کے تصور کو ایک گہرا فلسفیانہ پیراہن عطا کرتا ہے، جہاں خدا کی تدبیر میں تاخیر یا بھول چوک کا تصور اِس لیے ناممکن ہے کہ وہ ہر عہد کے ہر واقعے کو اپنے "علمِ حضوری" میں بیک وقت ملاحظہ فرمارہا ہے۔

چوتھا نکتہ–ایک فکری بحران، خدا اور انسان کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ:

جہاں یہ روایتی تصورات خدا کی عظمت اور کبریائی کو ثابت کرتے ہیں، وہاں ایک سنگین علمی اور جذباتی کمزوری بھی سامنے آتی ہے۔ اگر خدا وقت سے اِس قدر ماورا ہے کہ وہ تغیر سے پاک ہے، تو کیا وہ انسانی کرب کو محسوس کر سکتا ہے؟ انسانی تجربے کی بنیاد ہی وقت اور تغیر پر ہے۔ ہم دکھ سے سکھ کی طرف اور دعا سے قبولیت کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔

اگر خدا ایک ایسے مقام پر ہے، جہاں نہ کوئی تبدیلی ہے اور نہ کوئی لمحہ گزرتا ہے، تو وہ ایک "منجمد ہستی" معلوم ہونے لگتا ہے، جو انسانی تاریخ کے اُتار چڑھاؤ سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ جدید مفکرین اِسے خدا اور بندے کے درمیان "عدمِ تعلق" کا بحران قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ "مُقدّس اور ماورا" خدا ہے، جو وقت کی قید سے آزاد ہے، اور دوسری طرف انسان کی خواہش ہے کہ اُس کا خدا اُس کے "حال" میں اُس کے ساتھ شریکِ سفر ہو۔ یہ بُعد مکانی و زمانی الٰہیات کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر اُبھرتا ہے۔

خدا اور وقت کے اِس پُراسرار تعلق پر جدید دور میں برائن لیفٹو (Brian Leftow) کی کتاب "Time and Eternity" ایک شاہکار حوالہ ہے، جو قدیم فلسفے اور جدید منطق کو یکجا کرتی ہے۔ روایتی الٰہیات ہمیں ایک ایسے خدا کا تصور دیتی ہے، جو وقت کا خالق ہونے کے ناطے اُس کی ہر قید سے بلند ہے، مگر یہ بلندی ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے، جہاں عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اگر خدا وقت کی قید سے آزاد ہے، تو کیا ہماری دعائیں اور وقت میں پیش آنے والے واقعات اُس کے لیے کوئی اہمیت رکھتے ہیں؟

آٹھواں باب

خدا، ابدیت اور لمحۂ موجود

کیا وقت باری تعالیٰ کی ذات کا آئینہ ہے؟

جدید الٰہیات میں وقت اور خدا کے باہمی تعلق کے حوالے سے اہم نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض مفکرینِ الٰہیات کے مطابق خدا وقت سے مکمل طور پر لا تعلق نہیں ہے، بلکہ یسوع کی صورت میں ابدیت انسانی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔

کارل بارتھ اور رابرٹ جینگسن جیسے مفکرین یہ واضح کرتے ہیں کہ خدا کی ذات محض وقت سے باہر نہیں، بلکہ وہ ایک لامتناہی زمانی تسلسل کی مالک ہے۔

آسکر کولمین کے نزدیک مسیح کا وجود وقت کی لکیر میں ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی تاریخ کو معنی عطا کرتا ہے۔ جدید مذہبی فکر میں وقت کو خدا کی صفات کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔

خدا اور وقت کا انسانی تجسّس:

انسانی شعور کی تاریخ میں "وقت" ہمیشہ سے ایک ایسا سربستہ راز رہا ہے، جس نے جہاں سائنس دانوں کو الجھایا، وہاں مفکرین اور ماہرینِ الٰہیات کے لیے بھی "فکری تشکیک" کا سامان پیدا کیا۔

روایتی طور پر ہم وقت کو ایک ایسی لکیر سمجھتے ہیں، جس کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام بھی، لیکن جب اُس کا رشتہ خالقِ کائنات سے جوڑا جاتا ہے تو کئی "الٰہیاتی گتھیاں" جنم لیتی ہیں۔ کیا خدا وقت کی اِن لکیروں سے ماورا کسی تجرید (Abstraction) میں بستا ہے، یا وہ خود اِس زمانی بہاؤ کا حصہ ہے؟

جدید الٰہیات (Modern Theology) اِن سوالات کا جواب محض روایتی فلسفے کی روشنی میں نہیں دیتی، بلکہ وہ وقت کو خدا کی ذات کا ایک متحرّک اظہار قرار دے کر ہمیں کائنات اور خالق کے تعلق کو ایک بالکل نئے اور حیران کن زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔

مسیح میں ابدیت کا ظہور (کارل بارتھ کا نظریہ):

بیسویں صدی کے عظیم مفکر کارل بارتھ نے اِس بحث کا رُخ موڑتے ہوئے ایک انقلابی تصور پیش کیا، جسے وہ "ہمارے لئے خدا کا وقت "(God's Time for Us) کا نام دیتا ہے۔ بارتھ کے نزدیک ابدیت (Eternity) کا مطلب "وقت کی نفی" یا اُس سے فرار نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کا وہ ارادہ ہے، جس کے تحت اُس نے خود کو انسانی تاریخ کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ بارتھ کے نزدیک اِس "الٰہیاتی وقت" کا سب سے معتبر اور کامل اظہار مسیح کی صورت میں سامنے آتا ہے، جہاں ابدیت نے خود کو محدود لمحوں کے قالب میں ڈھال لیا۔ مسیح میں ابدیت نے خود کو وقت میں ظاہر کیا۔

بارتھ کی فکر ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ خدا نے وقت کو محض ایک مادی ضرورت کے طور پر پیدا نہیں کیا، بلکہ اُسے اپنی ابدیت کے ابلاغ کا ایک مُقدّس ذریعہ بنالیا ہے۔ یہاں سے ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ وقت کوئی بے جان شے نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے انسان کے لیے ایک عطیہ ہے۔

کیا خدا "وقت" سے ماورا ہے؟ (رابرٹ ینگسن کا منفرد نکتہ):

جہاں کارل بارتھ ابدیت کے "ظہور"(Manifestation) پر توجہ دیتا ہے، وہاں رابرٹ ینگسن اپنی "Systematic Theology" میں خدا کی ہستی اور وقت کے باہمی تعلق کی ماہیت پر بحث کرتا ہے۔ ینگسن اِس روایتی یونانی تصور کو مسترد کرتا ہے کہ خدا "Timeless"، یعنی "وقت سے مبرّا یا زمان و مکاں سے یکسر کٹا ہوا" ہے۔ اُس کا استدلال ہے کہ خدا کو "Timeless" کہنا دراصل اُسے ایک ساکن اور غیر متحرّک وجود قرار دینا ہے، جو انسانی تاریخ سے لاتعلق ہے۔ اِس کے برعکس وہ خدا کو " Temporal Infinity"، یعنی "زمانی ابدیت" کا مالک قرار دیتا ہے۔

اِس نکتے کی منطق یہ ہے کہ خدا وقت سے خارج نہیں، بلکہ وہ لامتناہی اور غیر محدود وقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ تصور اِس لیے غیر معمولی ہے، کیونکہ یہ خدا کو ہماری روزمرہ کی زندگی، ہمارے لمحوں کے تجربے اور انسانی تاریخ کے اُتار چڑھاؤ کے عین قریب لے آتا ہے۔ ینگسن کے نزدیک خدا وقت کی قید میں نہیں ہے، لیکن وقت اُس کی ذات کی وسعتوں سے باہر بھی نہیں ہے۔

وقت کی لکیر کا مرکز–یسوع مسیح (آسکر کولمین کی فکر):

اگر ینگسن کے نزدیک خدا لامتناہی وقت کا مالک ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کی اِس بکھری ہوئی لکیر کی سمت کیا ہے؟ اِس کا جواب آسکر کولمین کے ہاں ملتا ہے، جس پر گزشتہ ابواب میں بھی بحث ہو چکی ہے۔ کولمین نے تاریخ اور وقت کو ایک "لکیر" (Timeline) سے تشبیہ دی ہے، جس کا ایک خاص محور ہے۔ کولمین کی فکر کا حاصل یہ ہے کہ وقت کوئی اندھا بہاؤ یا دائروں کا سفر نہیں ہے، جس کی کوئی منزل نہ ہو۔

کولمین کے مطابق مسیح وقت کی لکیر کا مرکز ہے۔ یہ نکتہ تاریخ کو ایک نیا مذہبی اور روحانی وزن عطا کرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کی تمام پیش گوئیاں اور مستقبل کی تمام اُمیدیں اِسی ایک مرکزی نقطے پر آکر یکجا ہو جاتی ہیں۔ کولمین نے یہ واضح کیا کہ جب ہم مسیح کو وقت کا محور تسلیم کر لیتے ہیں، تو تاریخ کا ہر لمحہ (خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو) ایک خاص مقصد اور معنویت حاصل کر لیتا ہے۔

جدید الٰہیات کا نچوڑ–وقت خدا کی ذات کا حصہ ہے:

اِن تمام افکار کا عمیق مطالعہ ہمیں جدید الٰہیات کے ایک بڑے اور انقلابی نتیجے تک پہنچاتا ہے، یعنی جدید فکر میں وقت اب خدا کی ذات سے "خارج" کوئی مخلوق یا مادی پیمانہ نہیں رہا، بلکہ اِسے "خدا کی ذات میں شامل" سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ محض ایک نظریاتی تبدیلی نہیں ہے، بلکہ اِس کے اثرات انتہائی دُور رَس ہیں۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اور ہمارا زمانی وجود کوئی ایسا "سراب" یا "فریب" نہیں ہے، جو ہمیں خدا سے دُور لے جائے، بلکہ یہ خدا کی اپنی ذات میں "شراکت" (Participation) کا ایک موقع ہے۔ جب وقت خدا کی ذات کا حصہ قرار پاتا ہے، تو دنیا کا ہر واقعہ، ہر تبدیلی اور ہر لمحہ الٰہی فطرت کے اظہار کا ایک پیرایہ بن جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر کائنات کی تخلیق اور انسانی جدوجہد کو ایک تقدّس عطا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ جدید الٰہیات نے کارل بارتھ کے نظریہ "ظہورِ ابدیت"، رابرٹ ینگسن کی فکر "زمانی لامتناہیت" اور آسکر کولمین کے تصور "مرکزیتِ وقت" کے ذریعے ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ وقت اور خدا کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہے۔ وقت خدا کی حکمت، اُس کی موجودگی اور اُس کی ذات کی لامتناہی وسعت کا ایک آئینہ ہے۔ اگر وقت واقعی خدا کی ذات کا حصہ ہے اور ہماری تاریخ اُس کی ابدیت میں شامل

ہے، تو کیا ہماری اپنی زندگی کا یہ گزرتا ہوا "لمحہ" محض ایک مادی اکائی ہے، یا اِس میں کوئی ایسی ابدی اہمیت پوشیدہ ہے، جسے ہم اپنی غفلت میں فراموش کر رہے ہیں؟

نواں باب

ابدیت اور وقت کا سنگم

وجودِ مسیح کی ایک انقلابی تعبیر

اب ہم مسیحی الہٰیات کے ایک پیچیدہ نظریے یعنی یسوع مسیح کی دوہری فطرت کو ایک نئے علمی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مسیح کی ذات دراصل زمانیت اور ابدیت کا ایک زندہ اتحاد ہے، جہاں غیر مادی خدا نے انسانی وقت کے اندر صورت اختیار کی۔ اِس منفرد تشریح کی بنیاد قدیم کلیسیائی کونسلوں کی قراردادوں اور اہم جدید ماہرینِ الہٰیات کے افکار پر رکھی گئی ہے۔ تجسّم کا تصور محض ایک معجزہ نہیں، بلکہ زمان و مکاں کے باہمی تعلق میں سمجھنے کی چیز ہے۔

انسانی عقل ہمیشہ سے ایک ایسے قدیم اور پُراسرار سوال کے گرد گھومتی رہی ہے، جو فلسفے اور الہٰیات کی بنیاد ہے کہ وہ نکتہ کہاں ہے، جہاں "لامحدود" (Infinite) اور "محدود" (Finite) کا ملاپ ممکن ہوتا ہے؟ روایتی طور پر الوہیت اور انسانیت کو دو متضاد اور ایک دوسرے کی ضد سمجھا گیا ہے، جس نے عقلِ انسانی کے لیے ایک ایسا فکری تضاد پیدا کر دیا ہے، جسے حل کرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ایک الہٰیاتی تجزیہ نگار کے طور پر میرا کام قدیم روایات اور جدید فکر کے درمیان ایک ایسا "پُل" (Bridge) تعمیر کرنا ہے، جو اِس معمے کو سمجھنے کے لیے نئی راہیں کھولے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اِس مسئلے کی جڑیں مادی جوہر کے بجائے وقت اور ابدیت کے باہمی رشتے میں پوشیدہ ہوں؟ آیئے اِس قدیم سوال کو ایک نئے اور فکر انگیز زاویے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الوہیت ابدیت ہے، اور انسانیت زمانیت ہے:

روایتی الہٰیاتی بحثیں اکثر "جوہر" یا "فطرت" کے گرد گھومتی ہیں، لیکن اگر ہم اِس مسئلے کو ابدیت (Eternity) اور زمانیت (Temporality) کے نئے پیمانے سے دیکھیں تو ایک انقلابی تعبیر سامنے آتی ہے، مثلاً؛

1۔ الوہیت: اِس کا حقیقی مفہوم "ابدیت" ہے، جو وقت کی قید سے آزاد ہے۔

2۔ انسانیت: اِس کا اصل پیمانہ "زمانیت" ہے، یعنی وقت کے تسلسل میں مقید ہونا۔

یہ فکری تبدیلی اِس لیے نہایت اہم ہے، کیونکہ یہ ہمیں جمود کی شکار روایتی تعریفوں سے نکال کر ایک متحرّک (Dynamic) تفہیم کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہم انسانیت کو محض ایک مادی وجود کے بجائے "وقت" کے پیمانے سے دیکھتے ہیں، تو الوہیت اور انسانیت کا ملاپ دو متضاد مادّوں کا ملاپ نہیں رہتا، بلکہ ابدیت کا وقت کی حدود میں ایک پُر وقار ظہور بن جاتا ہے۔

زمان و مکاں کا زندہ سنگم:

اِس نئی تعبیر میں یسوع مسیح محض ایک تاریخی شخصیت نہیں رہتا، بلکہ وہ زمان و مکاں (Space and Time) کا ایک زندہ اور متحرّک اتحاد بن کر ابھرتا ہے۔ یہاں "تجسّم" (Incarnation) کا تصور اپنی روایتی شکل سے نکل کر ایک وسیع تر کائناتی حقیقت میں ڈھل جاتا ہے۔ تجسّم کا مطلب یہ نہیں کہ ابدیت نے خود کو ختم کر لیا، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ابدیت نے وقت کے پیرائے میں خود کو متشکل کیا، یعنی "تجسّم کو اِس طرح سمجھنا کہ "وقت" خود جسمانی صورت میں ظاہر ہوا"۔

یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ ابدیت نے وقت کی حدود کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ اُسے ایک نئی جہت اور معانی عطا کیے۔ اِس طرح مسیح کی ذات میں ابدیت اور وقت ایک دوسرے سے جدا نہیں رہتے، بلکہ ایک وحدت میں پروئے جاتے ہیں۔

قدیم کونسلوں سے جدید مفکرین تک:

یہ فکری سفر صدیوں پر محیط ہے، جہاں قدیم کلیسیائی بنیادوں پر جدید مفکرین نے علم و دانش کی بلند عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ اِس علمی تسلسل کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخی فریم ورک اور جدید فلسفیانہ توسیع کے درمیان فرق کو دیکھنا ہو گا، مثلاً؛

1۔ تاریخی فکری بنیادیں (Historical Framework):

(الف) مجلسِ قسطنطنیہ (451ء): اِس کونسل کی "خلقیدونی تعریف" (Chalcedonian Definition) نے مسیح کی دوہری فطرت کے حوالے سے پہلا باقاعدہ فکری ڈھانچہ فراہم کیا۔

(ب) ایریس نے مسیح کی ازلی موجودگی پر گہرے غور و فکر کا آغاز کیا۔

(ج) تھناسیس (Athanasius) کی شاہکار تصنیف "On the Incarnation" قدیم دَور میں تجسّم کے اسرار کو سمجھنے کی بنیاد بنی۔

2۔ جدید فلسفیانہ توسیع (Modern Expansion):

(الف) جُرگین مولٹمان (Jürgen Moltmann) نے اپنی کتاب " The Trinity and the Kingdom" میں قدیم تصورات کو جدید دَور کے مسائل اور فلسفے کے مطابق ایک نئی زبان دی۔

(ب) تھامس ٹورینس (Thomas Torrance) کی تحریر "Space, Time and Resurrection" زمان و مکاں اور حیاتِ مسیح کے تعلق کو سائنسی اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ واضح کرتی ہے۔

یہ تعبیر ہمارے لیے کیوں اہم ہے؟:

وقت اور ابدیت کے اِس ملاپ کو سمجھنا محض ایک خشک علمی بحث نہیں ہے، بلکہ یہ ہماری کائناتی تفہیم کو یکسر بدل دینے والا زاویہ ہے۔ جب ہم یسوع مسیح کو زمان و مکاں کے اتحاد کے طور پر تسلیم کرتے ہیں، تو مادی دنیا اور روحانی دنیا کے درمیان موجود مصنوعی دیوار گر جاتی ہے۔

یہ تعبیر اِس لیے بھی اہم ہے، کیونکہ یہ مادی کائنات اور ہمارے روزمرہ کے وقت کو "مُقدّس" (Sanctify) بنا دیتی ہے۔ اب مادی دنیا محض ایک فانی حقیقت نہیں رہتی، بلکہ یہ ابدیت کے ظہور کا مسکن بن جاتی ہے۔ اِس تصور کے ذریعے مُقدّس اور عام (Sacred and Secular) کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت کا ہر لمحہ ابدیت سے جڑا ہوا اور الٰہیاتی اہمیت کا حامل ہے۔

مختصر یہ کہ وجودِ مسیح کی یہ تعبیر ابدیت اور زمانیت کے درمیان موجود صدیوں پرانی خلیج کو پاٹ دیتی ہے۔ یہ ہمیں ایک ایسے مقام پر لے آتی ہے، جہاں وقت بذاتِ خود مُقدّس ہو جاتا ہے، کیونکہ اُسے ابدیت کا لمس نصیب ہوتا ہے۔ یہ فکر ہمیں اپنے حال اور اپنی مادی دنیا کو ایک نئے احترام کے ساتھ دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ اگر وقت خود ابدیت کا لباس پہن لے، تو ہماری روزمرہ کی زندگی کی لمحاتی حقیقتوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

دسواں باب

وقت کی قید سے ابدیت کی آزادی

مسیح کی حاکمیت اور "لمحہِ ابدیت"

جب ہم وقت اور ابدیت کے درمیان تعلق کو مسیحی تناظر میں سمجھتے ہیں تو انسان کی فانی حالت کا غم مسیح کی حاکمیت کے ساتھ اُمید میں بدل جاتا ہے۔ تصلیب اور جی اُٹھنے کا واقعہ انسان کو وقت کی قید سے آزاد کر کے خدائی زندگی میں داخل ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جب ایک فرد مسیح سے جڑ جاتا ہے، تو وہ ایک نیا وجود بن جاتا ہے، جو دنیاوی حدود سے ماورا ہو کر ابدیت کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ تصور بائبل کے متن سے واضح ہے کہ روحانی تبدیلی محض اخلاقی اصلاح نہیں، بلکہ زندگی کی نئی جہت کا آغاز ہے۔

عصرِ حاضر کا انسان ایک ایسی نفسیاتی اور وجودی کشمکش کا شکار ہے، جہاں وقت اُسے ایک بے رحم قید خانے کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں ہر لمحہ یہ احساس دبوچے رکھتا ہے کہ وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل رہا ہے اور ہم اُس کی بے پناہ رفتار کا مقابلہ کرنے میں مسلسل ہانپ رہے ہیں۔ یہ "وقت کی قِلّت" کا احساس محض ایک سماجی دباؤ نہیں ہوتا، بلکہ ایک روحانی بحران ہے، جو ہمیں اِس سوال پر مجبور کرتا ہے کہ کیا ہم وقت کے ابدی غلام ہیں یا اِس جبر سے آزادی کا کوئی راستہ موجود ہے؟

مسیحی الٰہیات اِس معمے کا حل ایک حیرت انگیز لاہوتی تصور میں پیش کرتی ہے، جسے "ابدیت کا لمحہ" (The Eternal Moment) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں لامحدود خدا ہماری محدود ساعتوں میں قدم رکھتا ہے اور ہمیں وقت کے ماتحت ہونے کے بجائے اُس کے آقا کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

وقت کی غلامی سے مسیح کی حاکمیت تک:

انسانی المیہ یہ ہے کہ وہ وقت کے تسلسل میں مقید ہے۔ ہم گزرے ہوئے کل کے پچھتاوؤں اور آنے والے کل کے اندیشوں کے درمیان ایک ایسی وجودی گرفت میں ہیں، جہاں حال کا سکون مفقود ہے۔ لیکن جب ہم کائناتی سطح پر مسیح کے مرتبے کا ادراک کرتے ہیں، تو ایک عظیم تبدیلی جنم لیتی ہے۔ مسیح محض تاریخ کا ایک حصہ نہیں، بلکہ وقت کا خالق ہے۔ اُس کا انسانی جسم اختیار کرنا(Incarnation) دراصل وقت

کے اندر خالق کا ایسا داخلہ ہے، جس نے وقت کو ایک "جال" یا "قید خانہ" رہنے سے بچا لیا۔ مسیح میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم وقت کی اُس بے رحم حاکمیت سے نکل کر اُس کے آقا کی پناہ میں آ جائیں، جہاں وقت ہمیں ہانپنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ الٰہی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ انسان وقت کا غلام ہے، اور مسیح وقت کا آقا ہے۔

صلیب، قیامت اور لمحۂ ابدیت:

صلیب اور قیامت محض دو تاریخی واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ کائناتی موڑ ہیں، جہاں ابدیت نے وقت کی سرحدوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ صلیب پر مسیح کی قربانی اور اُس کا جی اٹھنا ایک ایسی حقیقت ہے، جس نے وقت کے پرانے ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہاں "لمحۂ ابدیت" جنم لیتا ہے، یعنی ایک ایسا مقام، جہاں لافانی خدا کا جلال ہماری فانی تاریخ کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے۔

مشہور ماہرِ الٰہیات این ٹی رائٹ (N. T. Wright) اپنی فکر انگیز تصنیف "Surprised by Hope" میں اِسی تصور کی وکالت کرتا ہے۔ اُس کے مطابق مسیح کی قیامت نے مستقبل (ابدیت) کو حال کے اندر داخل کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جو وقت کے جبری تسلسل کو توڑ دیتی ہے۔ اب نجات محض مستقبل کا کوئی وعدہ نہیں، بلکہ ایک ایسی ابدی کیفیت ہے، جو آج کے لمحے کو معنی عطا کرتی ہے۔ اِس طرح "لمحۂ ابدیت" وہ مقامِ اتصال ہے، جہاں ہماری محدود زندگی خدا کی غیر محدود وسعتوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔

مسیح میں ایک نئی مخلوق--وقت سے ماورا زندگی:

اِس نئے وجودی تجربے کی بنیاد وہ "نئی مخلوق" ہے، جس کا ذکر ہمیں مُقدّس پولس کے کلام میں ملتا ہے۔ رومیوں 6:4-5 آیات ہمیں یہ بصیرت عطا کرتی ہیں کہ ہم مسیح کی موت اور قیامت میں شریک ہو کر ایک ایسی "نئی زندگی" میں چلنے کے لیے جی اُٹھے ہیں، جو موت اور وقت کے زوال سے بالاتر ہے۔ اِسی طرح 2-کرنتھیوں 5:17 کا یہ اعلان کہ "اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے"، محض ایک جذباتی دعویٰ نہیں، بلکہ ایک نئی وجودی حقیقت کا اظہار ہے۔

مسیح میں "نئی مخلوق" بننے کا عملی اور لاہوتی مطلب یہ ہے کہ ہم ابدیت کے اُس معیار کو آج ہی اپنی زندگیوں میں نافذ کریں، جو آنے والے جہان کا خاصہ ہے۔ یہ "وقت سے ماورا زندگی" صرف موت کے بعد کا کوئی انعام نہیں، بلکہ اِس کا آغاز اِسی لمحے سے ہوتا ہے۔ جب ہم خود کو مسیح کی ابدیت میں جُڑا ہوا پاتے ہیں، تو روزمرہ کی مصروفیات اور ڈیڈلائنز (Deadlines) کا خوف ہم پر غلبہ نہیں پاتا۔ ہم وقت کے دباؤ سے اِس لیے آزاد ہو جاتے ہیں، کیونکہ ہمارا مرکزِ نگاہ فانی ساعتوں کے بجائے خدا کا غیر متبدّل سکون اور اُس کا ابدی منصوبہ بن جاتا ہے۔

مسیحی دانش کی روشنی میں وقت محض ایک تیزی سے گزرتا ہوا بے مقصد تسلسل نہیں ہے، بلکہ یہ ابدیت کی تجلّی گاہ ہے۔ مسیح کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم وقت کے ہاتھوں یرغمال بننے کے بجائے اُس لافانی تعلق میں جینا سیکھیں، جو تصلیب اور قیامت کے وسیلے سے ہمیں میسر آیا ہے۔ زندگی اب محض سانسوں کا حساب نہیں رہی، بلکہ خدا کی حضوری میں ایک ابدی سفر کا عنوان بن گئی ہے۔

آج جب آپ اپنی زندگی کی گہما گہمی اور وقت کی کمی کے دباؤ کو محسوس کریں، تو ایک لمحے کے لیے رُک کر اِس سوال پر غور کریں کہ اگر آپ آج ابدیت کے اُس لمحے میں قدم رکھیں اور خود کو مسیح کی حاکمیت کے سپرد کر دیں، تو آپ کی زندگی کا رُخ اور وقت کے ساتھ آپ کا تعلق کس طرح بدل جائے گا؟

گیارہواں باب

تکثیریت پسندی اور مسیح کی حتمیت

وہ حقائق جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیں گے

لیسلی نیو بگن اپنی فکر اور تصانیف میں یسوع مسیح کی عالمگیریت اور حتمی حیثیت کی وضاحت کرتا ہے۔ اُس کے مطابق مسیح کی صورت میں الٰہی سچائی کا مکمل ظہور ہو چکا ہے، جس کے بعد کسی نئے نجات دہندہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دنیا میں مذہبی تقسیم کی بنیادی وجہ ایک حتمی کائناتی حقیقت کے اعتراف کا فقدان ہے، جبکہ مسیحی عقیدہ مسیح کو ہی وہ واحد حتمی حقیقت قرار دیتا ہے۔ نجات کا واحد راستہ صرف مسیح کی ذات سے وابستہ ہے۔ مسیح کے بعد کسی اَور وحی کا انتظار کرنا غیر ضروری اور بے معنی ہے۔

آج کا فکری منظر نامہ مختلف عقائد، متصادم نظریات اور فلسفیانہ لہروں کا ایک ایسا سمندر ہے، جہاں سچائی کا ساحل تلاش کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کثرت پسندی(Pluralism) کے اِس دور میں، جہاں ہر بیانیے کو برابر کی سطح پر رکھا جاتا ہے، انسانی ذہن اکثر اِس تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے کہ کیا سچائی واقعی اِتنی ہی لچکدار ہے کہ اُس کے ہزاروں روپ ہو سکتے ہیں؟ یا پھر کائنات کا کوئی ایک ایسا حتمی مرکز بھی موجود ہے، جو تمام فکری پراگندگی کو ایک نقطے پر سمیٹ لے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سچائی کی یہ تلاش تب تک ختم نہیں ہو سکتی، جب تک ہم اُس "مرکزی حقیقت" کا سامنا نہ کر لیں، جو انسانی تاریخ کے دھارے کو بدلنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہاں ہم الٰہیاتی شواہد کی روشنی میں یہ جائزہ لیں گے کہ مسیح کی شخصیت کس طرح تمام انسانی تلاش اور مذہبی انتظار کا منطقی انجام ہے۔

پہلا نکتہ – سچائی کا مجسم ہونا(Christ as the Embodied Truth):

مسیحی فکر کا سب سے گہرا اور انقلابی تصور "مجسم زمان"(Incarnate Time) ہے۔ مسیح محض ایک اخلاقی مصلح یا کسی اعلیٰ فلسفے کا پیامبر نہیں ہے، بلکہ وہ خود "حقیقتِ مطلقہ" کا انسانی پیکر میں ظہور ہے۔ یہاں ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جب ہم مسیح کو "مجسم زمان" کہتے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ "ازلی سچائی" خود وقت کی حدود میں داخل ہو کر انسانی تاریخ کا ایک ایسا حوالہ بن گئی ہے، جس سے اب انحراف ممکن نہیں۔

جب لامتناہی ابدیت خود انسانی تاریخ کے ایک خاص لمحے میں گوشت پوست کے ساتھ نمودار ہو جائے، تو اُس کے بعد کسی مزید تلاش یا کسی نئے الہامی پیغام کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ مسیح میں سچائی محض ایک نظریہ نہیں رہی، بلکہ ایک ایسی شخصیت بن گئی ہے، جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس ازلی سچائی کے تجسم کو یوحنا کی انجیل میں اِن الفاظ میں سمیٹا گیا ہے: "راہ، حق اور زندگی میں ہوں" (یوحنا 14:6)۔

دوسرا نکتہ - کثرت پسندی کا اصل سبب (The Root of Pluralism):

دنیا میں پائے جانے والے بے شمار مذہبی راستوں اور فکری تقسیم کا اصل سبب کیا ہے؟ اگر ہم گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ تقسیم اِس لیے ہے کہ انسانیت یا تو کسی "حتمی کائناتی سچائی" تک رسائی حاصل نہیں کر سکی، یا پھر اُس نے دستیاب سچائی کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ کثرت پسندی دراصل اُس فکری تشنہ لبی کا نام ہے، جو اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب انسان مرکز کو چھوڑ کر دائروں میں بھٹکنے لگتا ہے۔

مسیح کا دعویٰ اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ محض ایک نیا راستہ پیش نہیں کرتا، بلکہ وہ اُس کائناتی سچائی کو "فراہم" کر دیتا ہے، جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے بھٹک رہا تھا۔ جب وہ حقیقت، جو کائنات کی بنیاد ہے، خود کو ظاہر کر دے، تو پھر مختلف سمتوں میں بھٹکنا سچائی کی تلاش نہیں، بلکہ سچائی سے گریز بن جاتا ہے۔ مسیح کا وجود اِس لایعنی فکری کثرت کو ختم کر کے انسانیت کو اُس ایک مقام پر کھڑا کر دیتا ہے، جہاں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔

تیسرا نکتہ - نجات کا واحد وسیلہ (The Uniqueness of Salvation):

مشہور ماہرِ الٰہیات لیسلی نیوبگن (Lesslie Newbigin) نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "The Gospel in a Pluralist Society" میں ایک نہایت جرات مندانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ نیوبگن کا فکری ڈھانچہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ کثرت پسند معاشرے میں مسیح کی حتمیت کا دعویٰ محض ایک عقیدہ نہیں، بلکہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آج کے دور کا یہ فلسفہ کہ "تمام راستے ٹھیک ہیں"، درحقیقت سچائی کی فطرت سے ہی متصادم ہے، کیونکہ اگر ایک حتمی سچائی موجود ہے، تو پھر ہر دُوسرا متصادم راستہ درست نہیں ہو سکتا۔

عہد نامہِ جدید کا یہ دعویٰ کہ نجات کسی اَور کے وسیلے سے ممکن نہیں، موجودہ دور کے آزاد خیال نظریات کے لیے ایک بہت بڑا فکری چیلنج ہے۔ یہ دعویٰ اِس بنیاد پر ہے کہ جو خلا مسیح نے پُر کیا ہے، وہ کائنات کی کوئی دوسری ہستی یا نظام پُر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بائبل اِس حتمیت کو اِن الفاظ میں واضح کرتی ہے:
"اور کسی دُوسرے کے وسیلہ سے نجات نہیں، کیونکہ آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا، جس کے وسیلہ سے ہم نجات پا سکیں" (اعمال 12:4)۔

یہ ایک ایسی ٹھوس اور غیر مبہم حقیقت ہے، جو واضح کرتی ہے کہ اگر مسیح نے نجات کا کام مکمل کر دیا ہے، تو اُس کے بعد کسی نئے نجات دہندہ یا کسی دوسرے الہام کی تلاش منطقی طور پر ایک فکری غلطی ہے۔

چوتھا نکتہ-انتظار کا خاتمہ (The Meaningless Wait):

انسانی تاریخ کی داستان اصل میں ایک طویل انتظار کی داستان ہے، یعنی ایک ایسی کڑی کا انتظار، جو ٹوٹے ہوئے انسانی تعلق کو خالق سے جوڑ سکے۔ لیکن جب منزل سامنے آ جائے تو سفر جاری رکھنا دانشوری نہیں، بلکہ محرومی ہے۔ اُس کے بعد مزید انتظار بے معنی ہے۔

اگر کائنات کی وہ حتمی حقیقت (Finality)، جس کا صدیوں سے تذکرہ ہوتا رہا، مسیح کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے، تو اب کسی اَور سائے یا عکس کے پیچھے بھاگنا وقت کا ضیاع ہے۔ جب سورج طلوع ہو جائے تو چراغوں کی جستجو محض ایک لایعنی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ مسیح وہ انتہا ہے، جہاں پہنچ کر انسانی روح کا اضطراب ختم ہو جانا چاہیے، کیونکہ مرکز مل جانے کے بعد دائروں میں گھومنا سچائی کی توہین ہے۔

مسیح کی حتمیت کا مطالعہ ہمیں اِس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ وہ محض مذاہب کی فہرست میں "ایک اَور نام" نہیں ہے، بلکہ وہی انسانی تاریخ اور الٰہیاتی مکاشفے کا وہ نقطۂ کمال ہے، جس کے بعد سب کچھ مکمل ہو جاتا ہے۔ اُس کا "مجسم زمان ہونا" اِس بات کی ضمانت ہے کہ سچائی اب دستیاب ہے، اور اُس کا "نجات کا واحد وسیلہ ہونا" اِس بات کا ثبوت ہے کہ اب کسی اَور در پر دستک دینے کی ضرورت نہیں۔ کثرت پسندی کے اِس دھندلکے میں ہمیں خود سے ایک سنجیدہ سوال کرنا ہو گا کہ اگر مسیح ہی وہ حتمی سچائی ہے، جس کا کائنات کو انتظار تھا، تو کیا ہم اب بھی کسی اَور سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں؟

بارھواں باب

یسوع مسیح

زمان و مکاں کی قید سے نجات کی کلید

ہانس ارس وان بالتھاسر اور وولفہارٹ پانن برگ جیسے ماہرینِ الٰہیات کے افکار کی روشنی میں دیکھا جائے تو مسیح کی کائناتی حیثیت اُجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ اُن کے مطابق مسیح زمان و مکاں پر مکمل دسترس رکھتا ہے اور کائنات کی تفہیم کے لیے ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ انسانیت کو وقت کی قید اور محدودیت سے نجات دلانے کے لیے مسیح ہی واحد اور آخری اُمید ہے۔ وہ ابتدا اور انتہا ہونے کی حیثیت سے انسانی تاریخ کے تمام ادوار پر محیط ہے۔ یسوع ایک الوہی ہستی کے طور پر مادی حدود سے ماورا ہو کر کائنات کی رہنمائی کرتی ہے۔

انسانی زندگی کی پوری داستان دراصل وقت اور فضا کی اَن گِنت اُلجھنوں کے گرد گھومتی ہے۔ پیدائش کے پہلے لمحے سے لے کر موت کی آخری ہچکی تک ہم منٹوں، گھنٹوں اور برسوں کی ایک ایسی نادیدہ زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں، جس سے فرار بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ صرف وقت کی قید نہیں، بلکہ مکان یعنی مادی حدود کی وہ بندشیں بھی ہیں، جو ہماری پروازِ تخیل اور روحانی بقا کو ایک محدود دائرے میں مقید رکھتی ہیں۔ وقت کی یہ بے رحمی اور مادی حدود کی یہ تنگی انسانی بے بسی کا سب سے بڑا استعارہ بن کر اُبھرتی ہے، جو ہمیں مسلسل فنا اور زوال کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ یہاں یہ سوال نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ کیا کائنات کے اِس جبری زمانی اور مکانی ڈھانچے سے نکلنے کی کوئی راہ موجود ہے؟ کیا کوئی ایسی قوت ہے، جو اِس قید خانے کے دروازے کھول سکے؟

زمان و مکاں کی اصل کلید:

یسوع مسیح دراصل "زمان و مکان کی کلید" ہے۔ اِس تصور کا عمیق تجزیہ یہ واضح کرتا ہے کہ مسیح کی حیثیت محض ایک تاریخی شخصیت کی نہیں، جو وقت کے کسی خاص دھارے میں آئی اور گزر گئی، بلکہ وہ اِس

پورے کائناتی ڈھانچے کا معمار اور اِس کا حاکم (کنٹرولر) ہے۔ وہ اِس مادی کائنات (Space) کی وسعتوں اور وقت (Time) کی گردشوں پر محیط وہ ماورائی قوت ہے، جو کائنات کے مادی اور زمانی ڈھانچے کو ایک نظم عطا کرتی ہے۔ جب ہم مسیح کو اِس "کلید" کے طور پر دیکھتے ہیں، تو مادی اشیاء کی قدامت اور وقت کی ہیبت ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ ہستی خود اِس نظام کی خالق ہے اور اِس کے تمام قوانین اُس کے تابع ہیں۔ وہ کائنات کے مادی وجود کو ایک مقصد فراہم کرتا ہے اور زمان و مکان کے ہر گوشے پر اُس کا اختیار قائم ہے۔

وقت کی قید سے انسانیت کی آزادی:

مسیح کے اِس تصور کا عملی اور نفسیاتی پہلو انسانی روح کو وقت کے بھاری بوجھ سے نجات دلانا ہے۔ انسان عموماً ماضی کے تلخ پچھتاوؤں اور مستقبل کے اَن دیکھے خوف کے درمیان لٹکا رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ حال کی حقیقت اور ابدیت کے ذائقے سے محروم ہو جاتا ہے۔ مسیح بطورِ "کلید" انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وقت کی حدود ابدی سچائیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ جب ایک فرد اِس روحانی حقیقت سے وابستہ ہوتا ہے، تو وہ وقت کے فنا ہونے والے احساس سے نکل کر ایک ایسے قلبی اطمینان میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں مادی فاصلے اور گزرتے لمحے اُس کی داخلی آزادی کو سلب نہیں کر سکتے۔ یہ فکری نکتہ ہمیں سکھاتا ہے کہ مسیح کے ذریعے ہم زمان و مکاں کے غلام رہنے کے بجائے اِس کے مالک بننے کے عمل کا آغاز کرتے ہیں، جہاں موت اور زوال اب حتمی انجام نہیں رہتے۔

الفا اور اومیگا—آغاز و انجام کا مالک:

قدیم الہٰیاتی صحیفوں میں مسیح کی عالمگیر حیثیت کو "الفا اور اومیگا" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تصور اِس حقیقت کو راسخ کرتا ہے کہ مسیح وقت کی لکیر کے آغاز سے بھی پہلے موجود تھا اور اُس کے اختتام کے بعد بھی وہی ہو گا۔ وہ صرف تاریخ کے ایک باب کا نام نہیں، بلکہ پوری تاریخ کا خلاصہ اور اُس کا محور ہے: "میں الفا اور اومیگا ہوں" (مکاشفہ 13:22)۔

یہ کلام اِس بات کی سند ہے کہ کائنات کی ابتدا اُس کے حکم سے ہوئی اور اِس کا منطقی انجام بھی اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ الفا سے اومیگا تک کا پورا سفر، جس میں کائنات کی تمام مادی وسعتیں اور زمانی ادوار

شامل ہیں، اُس کی حاکمیت کے زیرِ اثر ہے۔ وہ آغاز اور انجام کے درمیان موجود ہر لمحے اور ہر ذرّے کا حقیقی وارث ہے۔

آخری اُمید اور جدید الٰہیات کا نقطہِ نظر:

جدید الٰہیاتی فکر میں مسیح کو زمان و مکاں سے نجات دلانے والی "آخری اُمید" کے طور پر پیش کرنا ایک مضبوط علمی بنیاد رکھتا ہے۔ قدیم صحائف کے اِن حقائق کو بیسویں صدی کے مفکرین نے جدید علمی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ہانس اورس وان بالتھاسر (Hans Urs von Balthasar) اپنی شہرہِ آفاق تصنیف "Theo-Drama" میں اِس کائناتی رنگ کا نقشہ کھینچتا ہے، جہاں مسیح ایک ایسی مرکزی ہستی کے طور پر اُبھرتا ہے، جو کائنات کے اسٹیج پر وقت کی جبریت کو مغلوب کر دیتا ہے۔ اِسی طرح وولف ہارٹ پینن برگ (Wolfhart Pannenberg) اپنی معرکتہ الآراء کتاب "Systematic Theology" میں یہ مدلل بحث کرتا ہے کہ مسیح ہی وہ نقطہ ہے، جہاں انسانی مستقبل اور تاریخ کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ علمی آراء اِس بات کی تائید کرتی ہیں کہ مسیح کا کردار محض مذہبی نہیں، بلکہ کائناتی ہے، جو انسانیت کو وقت کے زوال پذیر عمل سے نکال کر ایک پائیدار اور ابدی مستقبل کی طرف لے جانے کی واحد علمی اور روحانی ضمانت ہے۔

مسیح کا "زمان و مکاں کی کلید ہونا" ایک ایسا عالمگیر اور فکری تصور ہے، جو انسان کو اُس کی ظاہری اور مادی محدودیت سے بلند کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ ہم وقت کے کسی اندھے جبر کا شکار نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسی عظیم ہستی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جو ہمیں مادی قید خانوں سے نکال کر ابدیت کی وسعتوں سے روشناس کرانے کی قدرت رکھتی ہے۔ مسیح کے بغیر کائنات کا یہ زمان و مکاں ایک لایعنی اور دم گھٹنے والی کوٹھڑی کی مانند ہے، لیکن اُس کی ذات کے ادراک سے یہی زمان و مکاں ایک عظیم الوہی مقصد کی تکمیل کا راستہ بن جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اُس کلید کو پہچان کر زمان و مکاں میں اپنی حیثیت پر دوبارہ غور کرنے کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم وقت کی اِن زنجیروں کو توڑ کر اُس ابدی آزادی کا حصہ بننا چاہتے ہیں، جو مسیح کی صورت میں کائنات کے اُس پار سے ہمیں پکار رہی ہے؟